ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

SEPTEMBER 1986

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ مجلہ

حیات نو

جلد ۱ شمارہ ۳

ستمبر ۱۹۸۶ء

مدیر منتظم :- ـــــــــــــــ نور محمد فلاحی

مدیر :- ـــــــــــــــ طارق فاروقلیط فلاحی

● مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ●

قیمت فی شمارہ ۲ روپے ۵۰ پیسے

سالانہ تعاون ۲۵ روپے

ترسیل زر کا پتہ

●

جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ (یو۔پی) ۲۷۶۱۲۱

کتبہ عبدالحمید اعظمی

شاد آفسیٹ پریس اعظم گڑھ

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ	وہ شہر	ایڈیٹر	۳
مقالات	قرآن کی ادبی خصوصیات	سمیع اختر فلاحی	۵
	اقبال کی شاعری میں مردِ مومن کا تصور	سید لطیف حسین کاظمی	۱۹
	رشید الدین فضل اللہ ایک عظیم ایرانی مورخ	جمیل احمد نوری	۳۰
شخصیات	استاد عمر تلمسانی، ایک فرد ایک تحریک	مولانا خلیل احمد حامدی	۴۹
	مردِ حق آگاہ کا آخری سفر	منیر احمد خلیلی	۵۸
تصویرِ وطن	نئی تعلیمی پالیسی اور اس کے اثرات	ایڈیٹر	۳۵
عظمت کے مینار	حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ	ابو جاوید	۳۹
بساطِ عالم	سوڈان میں تحریکِ اسلامی کی پیش رفت	ستار طاہر	۱۷
گوشۂ ادب	مقدمہ شعر و شاعری	ڈاکٹر جمال آزاد اعظمی	۴۶
شعر و نغمہ	حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ	تاج الدین تاج	۳۸
	غزلیں	حفیظ میرٹھی، اختر اعظمی	۲۹
	غزلیں	آتش مہدی، عطا عابدی	۲۸
	غزل	بدر عالم خان ایم اے	۴۵
تعارف و تبصرہ		ادارہ	۶۱
حلقۂ یاراں		عبد الرحمان خالد، اشتیاق احمد، انور خان انور	۶۲
جامعہ کے لیل و نہار		نور محمد فلاحی سکریٹری انجمن	۶۴

اداریہ

وہ شہر

امن اور اہنسا کے پجاری مہاتما گاندھی کا گجرات اب انسانیت کا مذبح بن گیا ہے اور وہاں زندہ انسان جلائے جاتے ہیں

ہندوستان کے مشہور صنعتی شہر احمد آباد کی زمین کو جیسے انسانی خون اور گوشت کا چسکا لگ گیا ہے۔ مارچ ۱۹۸۵ء کا زمانہ کچھ زیادہ نہیں گذرا۔ ابھی کل کی بات ہے، گذشتہ ایک سال کی۔ جب احمد آباد کو جلایا گیا تھا۔ انہوں ہی نے آگ لگائی تھی، اسی دیش کے، بچے والوں نے، انسانیت کا دم بھرنے والے، اہنسا کی رگ الاپنے والے۔ بات ریزرویشن کی تھی اور تحریک ریزرویشن کے خلاف اٹھائی گئی تھی، لیکن پھر اس کا رخ بدل دیا گیا۔ دوکانیں مسلمانوں کی جلائی گئیں، مکان مسلمانوں کے پھونکے گئے اور مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ کہا جاتا ہے کہ اس وقت کے چیف منسٹر مادھو سنگھ سولنکی نے اپنی کرسی کی حفاظت کے لئے اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے اس کا رخ موڑ دیا۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ مسلمانوں کو قربانی کا بکرا کیوں بنایا؟ یہ ان سے کون پوچھے، اور وہ کیوں بتائیں۔ ۳۰۰ افراد ہی تو مارے گئے، ۶۰۰ ہی تو زخمی ہوئے تھے۔ ۹۰۰ کروڑ روپیہ ہی تو برباد ہوا تھا۔ مجموعی طور پر ۱۳۳ دن ہی تو کرفیو لگا تھا، اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ان کے لئے ایک معمولی بات تھی۔

پھر ایک سال بعد ۹ جولائی ۱۹۸۶ء کی تاریخ آگئی۔ گجرات کی تاریخ میں ۹ جولائی نے بڑا اہم مقام حاصل کر لیا ہے، امر سنگھ چودھری کی سوانح میں بھی۔ مورخ "آخر کیا لکھتا، اس عنوان سے وہ کیسے گزر جاتا" کیا وہ یہ لکھتا کہ موجودہ چیف منسٹر میں اس کی صلاحیت نہیں تھی یا یہ کہ دیش کے لئے اتنی معمولی قربانی وہ نہیں دے سکتے تھے؟

کہا جاتا ہے کہ مسلم لیڈران، جماعت اسلامی کے کارکن، شہر کے معزز مسلمان، پولیس کمشنر اور پولیس کمشنر دریاپور میں رتھ یاترا کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ انھوں نے خوشی خوشی ان کا استقبال کیا اور

کیا تھا آگے بڑھ گیا کاٹھی ناکہ میں جو ایک ہندو محلہ ہے۔ پھر کسی ہندو نے پتھر پھینکا اور کسی نے آواز پیدا کرنے والی کوئی شے۔ بس شروع ہو گیا دنگا۔ فساد اور بھگدڑ مچ گئی، اور دوسرے علاقوں تک پھیل گیا۔ مسلمانوں کی دوکانیں اور مکانات لوٹے اور جلائے جانے لگے اور مسلمان قتل کیے جانے لگے۔ کرفیو لگا دیا گیا۔ مگر ڈسٹ تاجر اور ہندو خاندان کے نوجوان سڑکوں پر گھومتے رہے۔ لوٹ مار کرتے رہے اور جلاتے اور مارتے رہے۔ پولیس تماشائی بنی رہی بلکہ مدد کرتی رہی۔ اس پر ایک اخبار والے نے لکھا: پولیس بھی تو آخر انسان ہے۔ اس کی بھی بھاؤنائیں (جذبات) ہیں۔ وہ اپنی قوم کا ساتھ کیوں نہ دے اور کیوں چشم پوشی نہ کرے...... پہلے وہ احمد آباد کے گنڈوں اور بدمعاشوں سے ہفتہ وصول کرتی تھی اب ان کے ساتھ تجارت کرتی ہے" اس میں تھوڑا اور اضافہ کر لیں۔ آخر وہ دنگا فساد کرنے والوں اور پلاننگ کرنے والوں میں شریک کیوں نہ ہو اور لوٹ گھسوٹ کا مال اپنے گھر کیوں نہ لے جائے۔ آخر اس کے بھی تو بیوی بچے ہیں۔ ان کے جذبات ہیں۔ اس طرح دو تین مہینے تک وہ بے فکر ہو جاتے ہیں۔

امر سنگھ چودھری نے اس وقت توجہ دی جب مرکز کا دباؤ بڑھا اور راجیو گاندھی کے حکم پر مرکزی وزیر پی چدمبرم احمد آباد آئے انھوں نے چیف منسٹر سے بات چیت کی اور پولیس آفیسروں کو بلا کر کہا کہ اگر فساد بند نہ ہوا تو تم ہی لوگ ذمے دار ہو گے۔ فساد رک گیا۔

دو روز میں ۹۰ سے زیادہ آدمی مارے گئے، ۲۰۰ سے زیادہ زخمی ہوئے، ۸۰۰ گھر اور ۱۰۰ دوکانیں لوٹی اور جلائی گئیں۔ کروڑوں کی دولت برباد کی گئی۔ میگھانی میں ۱۳ افراد کے ایک مسلم خاندان کو جلایا گیا۔ دو مسلمانوں کو سول اسپتال میں مار کر دوسری منزل سے نیچے پھینکا گیا اور پھر جلایا گیا۔ اس طرح ہندوستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب مکمل ہو گیا۔ بربریت اور درندگی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا گیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ آخر کب تک چلتا رہے گا۔ پچھلے ریکارڈ کب تک توڑے جاتے رہیں گے؟ آخر اس کا کوئی علاج بھی ہے؟ جواب بہت واضح ہے۔ اگر حکومت، پولیس اور لیڈران چاہیں تو فساد فوراً بند ہو جائے۔ مگر وہ کیوں چاہنے لگے؟ آخر ان کے بھی تو مفادات ہیں وہ کیسے پورے ہوں گے؟

اس فساد سے بچا جا سکتا تھا۔ اگر حکومت چاہتی۔

خفیہ پولیس نے پہلے حساس علاقوں کے بارے میں خبر دے دی تھی مگر اس پر توجہ نہیں دی گئی؟

(بقیہ صفحہ ۳۸ پر)

عنایت اختر فلاحی
ریسرچ فیلو، علی گڑھ

قرآن کی ادبی خصوصیات

قرآنی ادب کا تعلق اس دور کے مروجہ اسالیب میں سے کسی ایک سے بھی نہ تھا۔ قرآنی ادب نہ تو نظم ہے اور نہ ہی نثر کی کسی قسم سے تعلق رکھتا ہے، کیونکہ یہ نہ تو ایسی مسجع نثر ہے جس کے ہر جملے کا آخری لفظ اس کے بعد والے جملے کے آخری لفظ کے ہم وزن و ہم آواز ہوتا ہے اور نہ ہی ایسی نثر مرسل ہے جس میں عبارت سیدھی سادی بغیر قافیہ بندی کے لکھی جاتی ہے۔ اور نہ ہی اس کا ادب پرانے خطیبانہ انداز و اسلوب کی کسی صنف سے میل کھاتا ہے بلکہ وہ عربی زبان میں نثر کی ایک ایسی منفرد قسم ہے جس کا وجود اس سے قبل نہ تھا۔ اس میں نظم اور اعلیٰ معیار کے نثر کے باہم امتزاج کے ساتھ ایسا انوکھا اور اثر انگیز اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس کو ہم "قرآنی اسلوب" کے علاوہ اور کسی دوسرے لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم قرآن کے اندر ایسی پیہم، مسلسل، خوبصورت، رواں، سلیس اور دلآویز مسجع عبارتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں جن کی ترتیب و تناسب کچھ اس انداز پر کی گئی ہے کہ اس میں فصاحت و بلاغت کے تمام اہم اور بنیادی اصول و قواعد کے لحاظ کے ساتھ موسیقیت و شعری نغمگی کا ذائقہ بھی ملتا ہے۔ اس کے ساتھ پوری نثری سلاست و روانی بھی ہے۔ قرآنی سورتوں میں جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی آیتیں، مسجع جملے، عمدہ تشبیہیں، زوردار استعارے، عام فہم تشبیہات و تمثیلات استعمال کی گئی ہیں پھر مدنی سورتوں میں جہاں اصول و احکام کا ذکر ہے ان کے بیان کے لیے پختہ و سنجیدہ طرز بیان اختیار کیا گیا ہے۔

قرآنی اسلوب اس قدر مکمل، جامع، محکم اور پختہ ہے کہ آج چودہ صدی گزر جانے کے باوجود اس کے اندر قدامت کا کوئی شائبہ یا کسی تبدیلی کی قطعی کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوتی جب کہ اس طویل مدت میں عربی ادب کا اسلوب مختلف دور میں مختلف رنگ اختیار کرتا رہا۔ امیہ دور میں تصنع، بناوٹ یا مبالغہ آمیزی کا اثر تھا، عباسی دور میں تغزل نیز سیاسی رنگ کا غلبہ تھا جب کہ موجودہ دور میں عربی ادب نے سہل پسندی کا رخ اختیار کر لیا مگر قرآنی اسلوب میں کل

جو تازگی، شگفتگی اور دلکشی تھی وہ آج بھی علی حالہٖ موجود ہے۔

فصاحت

یعنی یہ کہ کلام کے اندر کوئی نحوی یا صرفی غلطی نہ ہو۔ کلام ہر طرح کے زبان و بیان کے عیوب سے پاک ہو۔ غریب و نامانوس الفاظ نہ استعمال کئے گئے ہوں اور نہ ہی متروک و قلیل الاستعمال تراکیب کا سہارا لیا گیا ہو۔ اور نہ ہی ایسے ثقیل اور عجیب الفاظ ہوں کہ زبان سے جن کی ادائیگی اور پردہ گوش پر ان کی سماعت شاق گذرے۔ مختصر یہ کہ کلام لفظی و معنوی ژولیدگی سے پاک ہو۔ موقع و محل کی پوری رعایت کے ساتھ ایجاز و اختصار کا بھی پورا لحاظ کیا گیا ہو۔

جب ان نکات کی روشنی میں ہم قرآنی کلام کی فصاحت کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ قرآن اپنے کلام کی فصاحت میں اس قدر بلند ہے کہ اس نے نہ صرف قریش کو بلکہ پورے عرب کو جن کو اپنی زبان دانی اور فصاحت و بلاغت پر اتنا ناز تھا کہ اپنے علاوہ دنیا کے تمام لوگوں کو عجمی (گونگا) کہا کرتے تھے یہ چیلنج دے دیا تھا کہ اگر تمہیں اپنی زبان دانی پر اتنا ہی غرہ ہے تو قرآن جیسی کوئی کتاب کیا کوئی ایک آیت ہی پیش کر کے دکھا دو۔ مگر پھر قرآن ہی نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ تم عرب تو کیا پوری دنیا، پوری کائنات، تمام مخلوقات مل کر بھی قرآن جیسی کوئی کتاب لانا چاہیں تو وہ اپنے اس مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

یوں تو انسان نے ہر زمانے میں بڑے بڑے معرکے سر کئے خاص طور سے موجودہ دور میں سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں ہونے والی محیر العقول ترقیات نے پوری انسانیت کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ کسی زمانے میں ناممکن سمجھی جانے والی چیزوں کو ممکن بنا دیا ہے۔ مگر نزول قرآن کے ایک طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود بھی جب کہ انسانی ذہن و دماغ برابر ترقی کر رہا ہے، اس کی صلاحیتیں اور قوتیں برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔ انسان اپنی تمام تر قوتوں اور صلاحیتوں کو صرف کرنے کے بعد بھی قرآنی کلام کی طرح کوئی فصیح کلام پیش نہ کر سکا۔ چنانچہ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے بڑے بڑے ادیب و ماہر فصحاء و شعراء قرآن کے اس چیلنج کو قبول نہ کر سکے۔ بعض سرپھروں نے اس سلسلے میں کوشش بھی کی مگر ان کو اپنی منہ کی کھانی پڑی۔ اس طرح کی ناکام کوشش کرنے والوں میں مورخین نے چند اشخاص کا تذکرہ کیا ہے جن میں "مسیلمہ کذاب" جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔

و "سجاح بنت الحارث بن السوید" جو عورتوں میں پہلی مدعیہ نبوت تھی کا ذکر خاص طور سے ملتا ہے۔ مورخین نے ان کے بقول ان کے اوپر نازل شدہ آیات کا تذکرہ بھی کیا ہے جو نہایت ہی مہمل اور انتہائی مضحکہ خیز ہیں، ان کا قرآنی کلام سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مشہور شاعر و ادیب ابو العلاء معری نے بھی اس قسم کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہا۔

منفرد طرز استدلال

قرآن نے افہام و تفہیم اور انسانی ذہن و دماغ میں کسی بات کو ذہن نشین کرانے کے لئے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے اس میں وہ منفرد ہے۔ قرآن نے نہایت ہی ٹھوس و مستحکم دلائل کے ساتھ عقلی پیرائے میں اپنے مدعا و مفہوم کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ قرآن نے اپنے مخاطب کو توحید کی دعوت دی اور پھر اس کے اثبات میں خود انسان کی تخلیق، نظام کائنات، آفتاب کے طلوع و غروب ہونے، چاند کی ایک خاص انداز میں گردش کو سامنے رکھ کر ان پر غور و فکر کر کے خدا تک پہنچنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ "و فی انفسکم افلا تبصرون" خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں کیا تم غور نہیں کرتے۔ یا دوسری جگہ پر یوں فرمایا ہے۔ فلینظر الانسان مما خلق، یعنی انسان کو اس چیز پر غور کرنا چاہئے جس سے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کا کوئی خالق ہے۔ اور وہ خالق ایک ہی ہے۔ اس امر کے لئے بھی آفاق و انفس سے دلائل دئے گئے ہیں۔ مختلف مقامات پر یہ مضمون بصراحت موجود ہے کہ کائنات کی ہر چیز خدا کی وحدانیت اور کمال ربوبیت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ کائنات کی ہر شے اس کی اطاعت گزار ہے۔ اسی طرح آخرت کی دلیل دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے "جس طرح وہ اشیاء کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ جس طرح وہ جانداروں کو پیدا کرتا اور مارتا ہے کیا وہ ذات ان کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔" (یٰسین ۷۹، ۷۸)

"قال من یحیی العظام وھی رمیم قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم"

کافر انسان نے کہا کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ وہ سڑ گل گئی ہوں، تم کہہ دو وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی مرتبہ ان کو بنایا تھا اور وہ ہر قسم کی پیدائش سے واقف ہے" اور جب اللہ تعالیٰ کی ذات قادر ہے تو کیا وہ انسانوں کے اعمال کے متعلق باز پرس کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا؟

اگر قادر ہے تو پھر اعمال کی بازپرس کیا کرے گا، اس نے دنیا کو یونہی بنا دیا یا اس کے پیچھے کوئی مقصد ہے؟ اس قسم کے نہ جانے کتنے سوالات قرآن خود اٹھاتا ہے پھر ان کا جواب بھی دیتا ہے۔ اور جواب کو دلائل سے اس قدر محکم کر دیتا ہے کہ پھر اس میں ذرہ برابر بھی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

بلاغت

بلاغت کے لغوی معنی رسائی حاصل کرنا، اصطلاح میں اس کے معنی مقتضائے حال کے مطابق فصیح زبان میں گفتگو کرنا ہے "البلاغ فی اللغۃ الوصول والانتہاء وفی الاصطلاح ھی مطابقۃ الکلام لمقتضی الحال مع فصاحۃ عبارتہ"۔ بلاغت کو بلاغت اسلئے کہتے ہیں کیونکہ اس کے ذریعہ مفہوم کی رسائی سامع کے دل تک ہوتی ہے اور اس طرح سے وہ بخوبی اس کی حقیقت کو پہنچ جاتا ہے۔ بلاغت کے لئے ضروری ہے کہ کسی شے یا فکر کی تقریر کے لیے ایسے منتخب الفاظ موزوں ترکیب اور عمدہ اسلوب ہو جس کے ذریعہ الفاظ و معانی کے درمیان موقع محل کے مطابق تاثیر و تاثر کے ساتھ ساتھ ذوق لطیف کی تسکین و آسودگی کا سامان فراہم ہو سکے ڈاکٹر بدوی طبانہ لکھتے ہیں:

"بلاغت کا دارومدار اولاً تو اس پر ہے کہ قرآن کے اسالیب اور طریقہ تعبیر کا علمائے بلاغت کے اسالیب سے مقابلہ کرکے اول الذکر کے عمدہ عناصر اور مؤخر الذکر کی خامیوں کی نشاندہی کی جائے۔ ثانیاً یہ کہ قرآنی آیات کا ان کے ادب کے سبب سے عمدہ اور بہتر کلام سے موازنہ کیا جائے تاکہ کلام مجید کے محاسن و فضائل کی برتری ان فصحاء و بلغاء کے کلام پر اچھی طرح واضح ہو جائے جن کی قوت بیان اور مہارت و یگانگی کے لوگ معترف ہیں۔ [1]

قرآن کریم کا سب سے بڑا معجزہ اس کی بلاغت ہے جس کا اعتراف صدر اول سے لے کر آج تک فصحاء و بلغاء کرتے آ رہے ہیں۔ ایک بلیغ کلام کے لئے یہ نہایت ناگزیر ہے کہ اپنے اندر تمام ظاہری ادبی و فنی محاسن کے ساتھ ساتھ اس کلام کے اندر جو خیال پیش کیا گیا ہے اس کے اندر بھی گہرائی و گیرائی ہو اور ساتھ ہی ساتھ ایجاز و اختصار کے زیور سے بھی آراستہ ہو اس لحاظ سے جب ہم قرآنی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی بلیغ کلام کی جو آخری انتہا ہو سکتی ہے یہ اس تک پہنچا ہوا ہے۔ اس کا کلام اس قدر فصیح و بلیغ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ادبی

[1] الدکتور بدوی طبانہ ۔ ماھیۃ البلاغۃ بحوالہ معارف دسمبر ۱۹۸۳

قوت اس کی ہمسری تو کجا اس کے مقابلے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، یہی وجہ ہے کہ آج چودہ صدی گزرنے کے بعد بھی اسلام دشمن عناصر کی جانب سے قرآن کے مقابلے میں کوئی کتاب (خواہ وہ معیار و مرتبے کے اعتبار سے بالکل کمتر ہی کیوں نہ ہو) پیش کرنے کی صدہا اور انتھک کوششوں کے باوجود ذرہ برابر بھی کامیابی نہ ملی۔ صدر اسلام میں فصاحت و بلاغت کے میدان میں شاعر کو امام تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ لبید بن ربیعہ جو سب سے بڑا آخری جاہلی شاعر تھا اس نے قرآن کی بلاغت کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ آمد اسلام سے قبل عرب کا یہ دستور تھا کہ وہاں کے جدید شعراء اپنا کلام تختیوں پر لکھ کر خانہ کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیا کرتے تھے اور قوم کا سب سے بڑا شاعر ان اشعار پر اصلاح دیا کرتا تھا چنانچہ یہ دستور آمد اسلام میں بھی باقی رہی جبکہ نزول وحی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا چنانچہ جب شعراء نے تختیوں پر اپنا اپنا کلام آویزاں کر دیا تو کسی صحابی نے ایک تختی پر سورۃ "انا اعطینک الکوثر فصل لربک وانحر" لکھ کر لٹکا دیا۔ چنانچہ لبید بن ربیعہ ایک طرف سے جب اصلاح دیتا ہوا اس تختی کے پاس پہنچا جس پر مذکورہ آیات کندہ تھیں۔ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی اس پر کوئی اصلاح نہ دے سکا اور اس پر لکھ دیا یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ یوں تو پورا قرآن فصاحت و بلاغت کا معجزہ نما ہے۔ میں بلاغت کی ایک نہایت ہی معمولی مثال پر ہی بات کو ختم کروں گا۔ "لکم فی القصاص حیاۃ" یہ آیت اپنے طول و عرض کے لحاظ سے نہایت مختصر ہے لیکن اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے اس قدر وسیع ہے جس کا احاطہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس آیت کے لئے کوزے میں سمندر بند کرنے والی مثال بالکل صادق و مصدوق ثابت ہوتی ہے۔ قرآن نے نہایت ہی بلیغ انداز میں یہ اصول بتا دیا کہ قصاص لینے ہی میں لوگوں کی زندگی ہے، یعنی قتل کا بدلہ قتل، مگر علمائے یورپ اور دانش کے ماہر محققین صدیوں اس عقدہ میں غلطاں و پیچاں رہنے کے باوجود بھی اس کا کوئی حل تلاش کرکے کسی آخری فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور اس کے موافقت و مخالفت میں سیکڑوں کتابیں تصنیف کی گئی ہیں مگر پھر بھی یہ موضوع اپنے اندر ویسی ہی تشنگی رکھتا ہے جیسا کہ کل۔

موزوں تشبیہات و تمثیلات

قرآن جابجا اپنے مخاطبین کو سمجھانے کے لئے مختلف قسم کے آسان ترین پیرایہ بیان کو اختیار

کرتا ہے، مشرکین کو توحید کی دعوت، مومنین کو راہِ حق میں صبر و استقامت اور منافقین کو
دین کے معاملے میں خلوص و خشیت کا درس دینے کے لئے قرآن تمثیلات و تشبیہات کا سہارا لیتا ہے
اور کسی بھی عمدہ ادبی کلام میں ظاہری حسن و کشش کیسا ہو ساتھ ہی تو تاثر اسی وقت پیدا ہوتی ہے
جبکہ اس ادبی نمونے کے اندر موزوں تشبیہات کی بھی مناسب رعایت رکھی گئی ہو۔

تمثیل یا تشبیہ ادب کی ایک دلنواز قسم ہے جو کسی بات کو سمجھانے یا سامع کے دل میں اتارنے کے لئے تیر بہدف کا سا اثر رکھتی ہے۔ گو کہ بلاغت کے یہاں تشبیہ و تمثیل کے درمیان معمولی فرق ہوتا ہے مگر بنیادی طور پر ان کے ارکان یکساں ہوتے ہیں۔ اس کے ذریعہ کلام کے اندر خوبصورتی و دلکشی کے ساتھ ساتھ بہت سے معنوی فوائد بھی ہیں اگر مخاطب کسی بات کو سمجھنے سے عاجز ہو یا بات تو سمجھ میں آگئی ہو مگر اس پر شرح صدر اور پورا اطمینان نہ ہو، کچھ شکوک و شبہات باقی رہ گئے ہوں تو پھر تمثیلات کے ذریعہ یہ تمام الجھنیں رفع ہو جاتی ہیں اور مخاطب کے دل میں جو خلا تھا وہ پر ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ عام فہم ہوا کرتی ہیں اور جو باتیں منطقی طرزِ استدلال سے بمشکل اور خاص ہی افراد کو سمجھائی جا سکتی ہیں لیکن وہی باتیں تمثیل کے زبان میں نہایت آسانی سے اور معمولی ساخت کے ذہن و دماغ رکھنے والے افراد کو بھی سمجھائی جا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر پیغمبر، ہر حکیم اور ہر مصلح قوم اور خطیب کو تشبیہات سے کام لینا پڑا۔ انبیاء علیہم السلام میں سیدنا مسیح تو تمثیلات کے بادشاہ تصور کئے جاتے ہیں، وہ دلائل کے طور پر ایسی تمثیلیں دیتے ہیں کہ ان سے بڑا عقلی استدلال بھی ان کے بالمقابل ہیچ نظر آتا ہے۔ اور حکماء و صوفیاء میں تشبیہات کا امام مولانا رومی سے بڑھ کر شاید کوئی نہیں۔

"قرآن کوئی منطق و فلسفے کی کتاب نہیں ہے بلکہ سراسر رشد و ہدایت ہے۔ اس کا بنیادی مقصد انسان کو ضلالت و گمراہی سے نکال کر صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی دعوت کو مخاطب کے دل کی گہرائیوں تک اتارنے اور اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لئے موزوں سے موزوں مثالیں پیش کرتا ہے اور یہ تمثیلات قرآنی نہ صرف یہ کہ موعظت و عبرت کے اعتبار سے نہایت اثر آفریں اور دلوں کو چھو لینے والی ہیں بلکہ ادبی و فنی اعتبار سے بھی نہایت اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔
قرآنی تمثیلات کے سامنے دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر اور ادیب کی دی ہوئی تشبیہات کی ساری

چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے اور اس کا حسن پھیکا پڑ جاتا ہے۔

نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ — تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔

اس تشبیہ کے اندر مشبہ اور مشبہ بہ کے اندر کئی ظاہری و باطنی چیزوں میں موافقت و مناسبت ہے۔ شوہر و بیوی کے آپسی تعلقات کو اس سے عمدہ تشبیہ کے ذریعہ ذہن نشین نہیں کرایا جا سکتا یعنی خاوند کا اپنی بیوی سے وہی رشتہ ہوتا ہے جو کہ ایک کسان کا اپنی کھیتی سے۔ جس طرح کھیتی سے غلہ پیدا ہوتا ہے اسی طرح بیوی بچے جنتی ہے، جس طرح کھیتی سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس کی نگہداشت اور اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے اسی طرح بیوی سے مستفید ہونے کے لئے اس کی ضرورتوں و مقتضیات کا پورا کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اس طرح اس کے اندر اور بھی بہت سے معانی پوشیدہ ہیں جن تک سامع یا قاری کا ذہن اول وہلہ میں پہنچ جاتا ہے۔ "أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ .... لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ"

"کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو، نہروں سے سیراب، کھجوروں انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا ہو، وہ عین اس وقت ایک تیز بگولے کی زد میں آکر جھلس جائے جبکہ وہ بوڑھا ہو اور اس کے کمسن بچے کسی لائق نہ ہوں، اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔"

یعنی جب تم یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہاری ساری عمر کی کمائی اس وقت تباہ ہو جائے جبکہ تمہیں اس کی ضرورت ہو تو پھر یہ کیسے پسند کر رہے ہو کہ اس دنیا میں ایک مدت گزارنے کے بعد جب تم آخرت کی ازلی زندگی کے لئے جاؤ تو تمہارا حال اس صاحب باغ کا ہو۔ یعنی اگر تم نے اپنی تمام توجہ و کوششیں دنیوی فوائد کے حصول میں صرف کر دی تو یاد رکھو کل (قیامت) تمہاری حالت اس جلے ہوئے باغ والے بوڑھے سے بھی زیادہ حسرتناک ہوگی۔

یہ ایسی تشبیہات ہیں جن کو پڑھنے یا سننے کے بعد انسان یونہی آگے نہیں بڑھ سکتا بلکہ اسکے بعد وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ ان پر غور کرے اور اپنے رویے پر نظر ثانی کرے۔ اس طرح ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں تمثیلات ایسی ہیں جو کہ اپنے اندر ادبی و فنی محاسن کے ساتھ ساتھ اثر آفرینی

ہیں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

تصویر کشی

زبان و ادب کے میدان میں طریقہ تصویر کشی، مافی الضمیر کی ادائیگی اور مخاطب کے دل کی گہرائیوں تک کسی بات کو اتارنے کا نہایت اعلیٰ و موثر طریقہ تصور کیا جاتا ہے اور علماء ادب کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ مدعا کو لوگوں کے سامنے مجرد ذہنی و خیالی تصور کی حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے مرئی و جسمانی مناظر میں پیش کرنا زیادہ موزوں ہوتا ہے۔ منظر کشی قرآنی ادب کے نمایاں ترین ادبی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت ہے۔ تصویر کے ذریعہ قصص، واقعات حوادث جو کہ محض ایک خیالی و تصوراتی چیزیں ہیں متحرک محسوس صورت میں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ اسی طرح جب ہم قرآنی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے وہ تمام چیزیں جو اس کے اندر واقعے یا حکایات کی شکل میں بیان کی گئی ہیں، کسی متحرک کردار کی طرح چلتے پھرتے نظر آتی ہیں۔ ہم ایک لمحے کے لئے بھول جاتے ہیں کہ ہم کوئی آیت پڑھ رہے ہیں یا کوئی فلم دیکھ رہے ہیں۔

"ان الذین کذبوا بآیٰتنا واستکبروا عنها لا تفتح لهم ابواب السماء ولا یدخلون الجنة حتی یلج الجمل فی سم الخیاط" (اعراف ۴۰)

یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ روز جزا کفار کو بارگاہ الٰہی میں مقبولیت حاصل نہیں ہوگی، وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ اس آیت کو سننے کے بعد سامع کی نگاہوں کے سامنے چند تصویریں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ پہلے یہ کہ آسمان کے کھلنے، پھر کفار کے اس میں داخل نہ ہونے، پھر اونٹ کے سوئی کے ناکے میں داخل ہونے کے مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح قرآن میں انسانی احوال اور ماضی میں واقع شدہ حالات و واقعات کے مناظر کو اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے کہ انسان انہیں بچشم سر آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ ٹھیک اسی طرح مستقبل میں پیش آنے والی چیزوں، غیب سے متعلق اخبار و واقعات اور قیامت کے روز پیش آنے والے کافروں کے ہولناک و دردناک مناظر کو اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ جیسے وہ ذہن پر کوئی سکرین ہو اور اس پر انسان ان تمام مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔

قرآن انسانی نفسیات نیز مختلف انسانی کمزوریوں (حسد، ہٹ دھرمی، نفاق، ضعف ...

کی ایسی منظر کشی کرتا ہے کہ جس میں گرفتار آدمی کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر ایسے اشخاص کی منظر کشی یونس ۲۲، ۲۳، محمد ۲۰، بقرہ ۲۴۶ میں کی گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ماضی میں پیش آئے ہوئے واقعات و حوادث کی تصویر کشی کچھ اس انداز سے کرتا ہے کہ ان کے اندر حرکت و زندگی آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب قرآن غزوہ احزاب میں واقع شدہ حوادث و حالات نیز کفار کی شکست و رسوائی، مومنین کے نظم کی پابندی نہ کرنے کی منظر کشی کچھ اس طرح کرتا ہے کہ چشم تصور کے سامنے جنگ کے یہ سارے مناظر کسی فلم کی ریل کی طرح دکھائے جا رہے ہوں۔ (احزاب ۹-۲۰)

نظم و ترتیب

کسی بھی فصیح و بلیغ کلام کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے اندر نظم و ترتیب ہو۔ اس کلام کے اجزائے ترکیبی کے درمیان اتصال ہو، شروع سے آخر تک پورے کلام کے اندر تسلسل و روانی موجود ہو۔ مخالفین اسلام اور مستشرقین نے ہر زمانے میں نظم و ضبط کے پہلو سے قرآن کو اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کا یہ اعتراض ہے کہ قرآن کے اندر کوئی ترتیب نہیں۔ ان کے آیات کے مابین کوئی اتصال ہے اور نہ ہی اس کے اجزاء کے درمیان کوئی ارتباط۔ اس کا ہر جز ایک دوسرے سے الگ اور نئے معانی و مقاصد کے درمیان شدید اختلاف ہے۔ کسی ایک سورت کے مباحث کے اندر نہ تو کوئی ترتیب ہے اور نہ ہی کسی مقصد کا تعین ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند آیات کو بغیر کسی متعین مقصد کے ایک جگہ اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ ایک ہی سورہ کے اندر موعظت و عبرت سے متعلق آیتیں ملتی ہیں، تو پھر جہاد کے اصول و قوانین کا تذکرہ ہوتا ہے، پھر حکومت و سیاست سے متعلق قواعد بتلائے جاتے ہیں اور پھر اسی میں آگے چل کر گذشتہ انبیاء و رسل کا تذکرہ ملتا ہے۔

ہمارے متقدمین نے اس اعتراض کا جواب کچھ اس طرح سے دینے کی کوشش کی ہے کہ اگر قرآن کے اندر بھی اسی طرح ترتیب و تبویب ہوتی جس طرح کہ دنیوی اور انسانی کتابوں میں ہوتی ہے تو آخر کار پھر ایک آسمانی صحیفے اور دنیوی کتاب میں کیا فرق باقی رہ جاتا۔ ترتیب کی ضرورت تو بشری کلام ہی میں ہو سکتی ہے خدا کا کلام اس سے بلند و برتر ہے جس طرح سمندر کی چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کی طرح حد بندی نہیں کی جا سکتی اسی طرح کلام الٰہی پر بھی اس قسم کی پابندیاں نہیں لگائی جا سکتیں۔

بہرحال اعتراض کا جواب تو نہیں ہو سکتی بلکہ ایسا کہہ کر ہم ایک طرح سے اس اعتراض کو تسلیم کرتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اس قسم کی کسی کمزوری کا شکار تو درکنار بلکہ اس کے معمولی عکس سے بھی دور ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کسی کلام کے اندر نظم و ترتیب کی جو انتہائی و آخری شکل ممکن ہو سکتی ہے وہ قرآنی آیات میں موجود ہے۔ یہ کہنا کہ نظم و ترتیب صرف بشری کلام کے اندر حسن پیدا کر سکتا ہے، کلام الٰہی اس سے بلند ہے، کسی طرح درست نہیں۔ کیونکہ ہر فصیح و بلیغ کلام کے لئے ترتیب کا پایا جانا ضروری ہے، یہ عمدہ کلام کی خوبیوں میں سے ہے۔ قرآنی سورتوں کے درمیان آیات کی ترتیب آپؐ کی نگرانی اور آپؐ کے حکم سے انجام پائی تھی۔ جب آپؐ پر کوئی آیت نازل ہوتی تو اس کے ساتھ اس امر کی تلقین بھی کر دی جاتی کہ اس آیت کو فلاں سورہ میں فلاں آیت کے بعد درج کر دیا جائے۔ چنانچہ آپؐ کاتبین وحی کو آیت بتاتے وقت اس کی ترتیب کے بارے میں بھی بتا دیتے تھے۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں جو ترتیب و تدوین کا کام ہوا وہ آیات کی ترتیب نہیں بلکہ مختلف اوراق اور تختیوں پر جو سورتیں کندہ تھیں ان کو یکجا کرنا تھا۔

قرآنی سورتوں میں آیات کے درمیان نظم و ربط کے مشاہدے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس غرض و غایت کو سامنے رکھا جائے جس کے تحت وہ سورہ نازل کی گئی۔ پھر اس امر پر غور کیا جائے کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے پھر ان عناصر کے مراتب کا تعین اس اعتبار سے کیا جائے کہ کون سا عنصر مطلوب و مدعا سے زیادہ قریب ہے اور کون کم قریب۔ پھر ان عناصر کے بیان کرنے کے طریقوں پر غور کیا جائے کہ کونسا ایسا بلیغ طریقہ اختیار کیا جائے کہ وہ بات سامع کے دل تک پہنچ جائے۔ اگر ان نکات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم قرآنی آیات کے درمیان ربط و ضبط تلاش کریں گے تو ہر سورہ کی ہر آیت ایک دوسرے سے مربوط نظر آئے گی۔ آیات کے مابین ربط تلاش کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ سورہ کے نازل ہونے کے وقت کے تاریخی پس منظر اور ان حوادث و واقعات کو بھی سامنے رکھا جائے جس میں وہ سورہ نازل ہوئی کیونکہ اس کے اندر زمانے کا لحاظ بھی موجود ہوتا ہے۔

مقصدیت: ہر زمانے میں دو طرح کے ادب کا وجود رہا ہے ایک تو ادب برائے ادب، دوسرا ادب برائے زندگی۔ اور ہر دور میں موخر الذکر قسم یعنی ادب برائے زندگی کو اولیت و فوقیت

حاصل رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایسا ادب جس کے پیچھے کوئی مقصد ہو کوئی غرض و غایت ہو ہر دور میں مہمل اور ادب برائے ادب سے بہتر اور اچھا تصور کیا گیا ہے۔ مقصدیت ادب کی اعلیٰ و نمایاں ترین خوبیوں میں سے ہے۔ اور جب ہم اس نقطۂ نظر سے قرآنی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے ہر آیت میں مقصدیت کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے اور وہ مقصد بھی اس قدر اعلیٰ و ارفع ہے کہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

بعثت نبوی سے قبل عربوں کی معاشرتی و معاشی زندگی میں پھیلی ہوئی بد عنوانیوں و انتشار سے کون شخص ناواقف ہوگا۔ تمام تر اخلاقی و سماجی برائیاں ان کے اندر موجود تھیں۔ معمولی باتوں پر ہونے والی جھگڑوں کا سلسلہ سالہا سال تک جاری رہتا۔ قرآن نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ان کے آپسی اختلافات، گروہی و نسلی تعصبات، علاقائی و لسانی عصبیتوں کو ختم کر کے ان کو اخوت بھائی چارگی، الفت و محبت کے ایک لڑی میں پرو دیا، وہی عرب جن کے اندر تمام تر اخلاقی و سماجی برائیاں موجود تھیں ان کو سرے سے ختم کر کے ان کے اندر مساوات و ہمدردی، غمخواری و غمگساری، ایثار و قربانی اور اس جیسے دوسرے اعلیٰ اوصاف پیدا کر دے۔

اذ كنتم اعداء فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته اخوانا وكنتم على شفا حفرة من النار فانقذكم منها كذلك يبين الله لكم آياته لعلكم تشكرون

قرآن نے دین و دنیا کا ایک بالکل نیا اور انوکھا تصور پیش کیا ہے۔ اس نے یہ واضح کر دیا کہ دین و دنیا دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس نے نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی، اس کی کامیابی و کامرانی کا وہ نسخہ پیش کیا جس سے دنیا اب تک ناآشنا تھی۔ اس نے انسانوں کے سامنے توحید، رسالت اور آخرت کا تصور پیش کیا، تمام باطل ادیان اور جھوٹے خداؤں کی تردید کی گئی ہے، اخلاق فاضلہ، اعلیٰ انسانی قدروں، عدل، احسان، ایفائے عہد عفو و درگزر، منکرات و فواحش سے دوری، معروفات و بھلائیوں سے رغبت کی تعلیم دی گئی ہے گذشتہ معذب قوموں کے ہلاکت نیز سبب ہلاکت کا تذکرہ کرتے ہوئے کفار کو توحید کی دعوت دی گئی ہے۔ معاشرے، سماج، خاندان سے متعلق احکامات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ شادی، بیاہ، طلاق، عدت، وراثت سے متعلق قوانین کی تشریح کی گئی ہے۔ غرضیکہ قرآن کے اندر کوئی

ایک آیت بھی ایسی نہیں جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ اس کے پیچھے کوئی مقصد نہیں ہے مگر اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ قرآنی کلام مقصدیت پر اس قدر زور دیتا ہے کہ کلام کا ظاہری حسن متاثر ہوتا ہے بلکہ یہ تو کلام الٰہی کی شان ہے کہ اس کے اندر غایت درجہ مقصدیت کے باوجود اس کا ظاہری حسن کہیں سے داغدار نہیں ہونے پاتا بلکہ اس کے حسن و خوبصورتی، کشش و دلآویزی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

وجہ اعجاز

تمام ہی علماء و مفسرین اور نقادان ادب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ قرآن کا اعجاز اس کے اعلیٰ و ارفع ادب و فن میں ہے لیکن اختلاف اس امر میں ہے کہ ادب کی مختلف فروع، فصاحت بلاغت، نظم و ترتیب، میں سے کس صنف میں اعجاز ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فصاحت و بلاغت میں ہے بعض کا خیال ہے اس کے کلام اور جملوں کے مابین عمدہ ترکیب و تالیف میں ہے۔ بیشتر ادباء کا خیال ہے کہ قرآن کا اعجاز اس کے منفرد و یکتا اسلوب میں ہے۔ مشہور نقاد جاحظ کی رائے یہ ہے کہ قرآن کا اعجاز اس کے منفرد اسلوب بیان، سحر انگیز بلاغت، دلکش انداز بیان اور عمدہ نظم و ترتیب میں ہے۔ لوگوں نے اس اسلوب بیان کی نظیر پیش کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے اور یہ قرآن کا اعجاز ہی تھا جس نے لوگوں کو قرآنی اسلوب کے مقابلے میں کوئی دوسرا اسلوب پیش کرنے سے عاجز و درماندہ کر دیا تھا۔ عبدالقاہر الجرجانی نے بھی جاحظ کے خیال کی ہمنوائی کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ قرآن کا اعجاز اس کے عمدہ نظم و ترتیب، حسین و بدیع انداز بیان میں ہے۔

علامہ قاضی عیاض نے قرآن کے اعجاز کے سلسلے میں چار چیزوں کا اعتبار کیا ہے۔ پہلی چیز تو یہ کہ اس کی ترتیب و تالیف میں عمدگی، کلام اور جملوں میں درستگی، زبان و بیان میں فصاحت و بلاغت نیز ایجاز و اختصار کی پوری رعایت، دوسری چیز اس کا منفرد ربط و ضبط اور وجوہ عربی اسالیب سے بالکل ہی مختلف و نمایاں اسلوب جو کہ نہ تو نظم کے طرز سے میل کھاتا ہے اور نہ ہی نثر کے عناصر پورا اترتا ہے۔ تیسری چیز یہ کہ غیب کے سلسلے میں عجیب و غریب واقعات کا تذکرہ۔ چوتھی چیز یہ کہ ماضی کی معذب و ہلاک شدہ قوموں کا تذکرہ۔

(بقیہ صفحہ ۶۰ پر)

بساط عالم

ستار طاہر

سوڈان میں تحریک اسلامی کی پیش رفت

سوڈان کے حالیہ انتخابات نے جہاں خود سوڈان کے سیاسی مبصروں کو حیران کر دیا ہے وہاں مشرق وسطیٰ میں موجود مغربی مبصروں کو بھی چکرا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ سوڈانی رہنما صادق المہدی کی سیاسی جماعت یوشنل امہ پارٹی (این یو پی) بھاری اکثریت سے انتخابات میں کامیاب ہوگی۔ جناب صادق المہدی متوازن اسلامی ذہن رکھنے والے رہنما ہیں۔ سوڈان میں جس دوسری سیاسی جماعت نے کامیابی حاصل کی ہے وہ ڈیموکریٹک یونینسٹ پارٹی (ڈی یو پی) ہے۔ اس کا ذہن بھی اسلامی ہے۔ یہ جماعت جناب صادق المہدی کی حلیف بھی ہے۔ اس کے سربراہ محمد عثمان المرغنی ہیں۔ یہ ختمیہ نامی مذہبی گروہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ ادھر وہ سیاسی جماعتیں جو سوشلسٹ اور ترقی پسند ہونے کی دعویدار تھیں ان کا سوڈان میں انتخابات کے ذریعے عوام نے صفایا کر دیا ہے۔

سوشلسٹ نظریات کی علمبردار عراق نواز بعث پارٹی نے ڈی یو پی کے ساتھ ایک متحدہ محاذ بھی قائم کیا تھا۔ اس متحدہ محاذ کو غیر ملکی حمایت بھی حاصل تھی جس کا برملا اظہار انتخابات کے دنوں میں کیا گیا لیکن سوڈان کے عوام نے سوشلسٹ معیشت یکسر مسترد کر دی۔

سوڈان کی آبادی دو کروڑ بیس لاکھ ہے۔ اس میں رجسٹرڈ ووٹروں کی تعداد ساٹھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان انتخابات میں پچاس لاکھ یعنی اسی فیصد ووٹروں نے ووٹ ڈالے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں شرح خواندگی بیس فیصد سے کم ہے، یہ انتخابی ریکارڈ شاندار ہے۔ کل انتخابی حلقے ۲۰۱ تھے۔ پہلے جن ۲۰۰ حلقوں کے نتائج سامنے آئے ان میں اسلامک نیشنل فرنٹ (آئی این ایف) نے ستائیس نشستیں حاصل کیں اور کمیونسٹوں کو فقط دو نشستیں ملیں اور ناصر نواز بعثی اور سوشلسٹ یونینسٹ ایک بھی نشست حاصل نہ کر سکے۔

ان انتخابات سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ دیہی علاقوں میں آج بھی مہدی سوڈانی کے انصار کو مقبولیت حاصل ہے جن کی نمائندگی یوشنل امہ پارٹی کر رہی ہے۔ جہاں تک اخوان المسلمون کی نمائندہ جماعت اسلامک نیشنل فرنٹ کا تعلق ہے اسے پڑھے لکھے اور شہری طبقے نے خاصی تعداد میں ووٹ دیئے

خلیج کے ممالک میں کام کرنے والے سوڈانیوں کے زیادہ تر ووٹ بھی اسی جماعت کو ملے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اسلامک نیشنل فرنٹ کے مضبوط امیدواروں کو ہرانے کے لئے این این یو پی اور ڈی یو پی جیسی اسلامی جماعتیں اور سوشلسٹ یعنی اور کمیونسٹ سب متحد ہو گئے تھے۔ خرطوم کی اس نشست پر تو گھمسان کا رن پڑا تھا جہاں اسلامک نیشنل فرنٹ کے رہنما ڈاکٹر حسن ترابی امیدوار تھے۔ ان کا حریف بارہ ہزار ووٹ لے کر کامیاب رہا جبکہ ڈاکٹر ترابی نے دس ہزار ووٹ حاصل کئے۔ انتخابات سے پہلے عراق نواز بعث پارٹی نے اپنے تمام ذرائع و وسائل ان کے خلاف پروپیگنڈے میں جھونک دیے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب پینتالیس فیصد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

اسلام سے محبت کا اظہار جو سوڈان کے عوام نے کیا ہے ہم پاکستانی اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ سوڈان کے سابق صدر نمیری نے سولہ برس تک سوڈان پر حکمرانی کی اور وہ دنیا کو دکھانے کے لئے مصر کی تقلید کرتے رہے پھر اپنے آخری دنوں میں انھوں نے اسلامی شریعت کا نفاذ کیا مگر ان کی تمام پالیسیاں عوام کی روح کو فتح نہ کر سکیں اور جونہی اٹھارہ برس کے بعد صحیح معنوں میں انتخابات ہوئے عوام نے اسلام کے حق میں ووٹ دے کر اپنے جذبوں اور امنگوں کا عملی ثبوت فراہم کیا۔

دو ہفتے کے مذاکرات کے بعد وزیر اعظم صادق المہدی نے سوڈان کی نئی بیس رکنی کابینہ بنائی ہے وہ خود وزیر دفاع بھی ہیں۔ یہ مخلوط قومی حکومت امہ، ڈیموکریٹک یونینسٹ پارٹی اور جنوب سے تعلق رکھنے والی چھوٹی جماعتوں کی کو الیشن پر مشتمل ہے۔ ڈی یو پی کے شریف ہندی نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ ہوں گے۔ اسلامک نیشنل فرنٹ اور [illegible] کی پارٹی حزب اختلاف کے فرائض انجام دیں گے۔

(اردو ڈائجسٹ)

(بقیہ لیل و نہار)

اخلاقی نشوونما کے لئے بھی پروگرام بنایا ہے، چنانچہ ایک ہفتہ نماز کا ہفتہ منایا جا رہا ہے جس میں مختلف اساتذہ سے نماز کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرایا جا رہا ہے، طلبہ کو نماز کی اہمیت اس کے فوائد بتائے جا رہے ہیں، اور نماز سے سستی و غفلت کے خطرناک انجام سے ڈرایا جا رہا ہے۔ انھیں فرائض کے علاوہ سنن و نوافل کی ترغیب دلائی جا رہی ہے۔ خدا کرے اس طرح سے مختلف نوعیتوں کے پروگرام بنیں تاکہ طلبہ تعلیمی و تربیتی دونوں حیثیتوں سے ترقی کر سکیں۔ جامعہ میں عیدالاضحی کے موقع پر ۸ ذوالحجہ سے ۱۵ ذوالحجہ تک تعطیل رہے گی جس میں زیادہ تر طلبہ اپنے گھروں کو روانہ ہوں گے اور عید اپنے گھروں پر والدین کے ساتھ کریں گے۔

سید لطیف حسین کاظمی، ایم اے، ایم فل
ریسرچ اسکالر، شعبہ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اقبال کی شاعری میں مردِ مومن کا تصوّر

اسلامی فکر میں اقبال کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس نے اپنی فکر کی بنیاد انسانی وجود کے بارے میں غور و تعمق پر رکھی ہے۔ خدا اس کی فکر کا منتہیٰ اور مدعا ہے لیکن انسانی وجود اس کی فکر کا مرکزی نکتہ ہے۔ خلیفۃ الارض ہونے کے ناطے انسان خدا کے پیغام کا مخاطب ہے اور وہی مکلف بھی۔ اس لئے مذہبی فلسفے کے لئے انسانی وجود مرکزی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ عروج آدم کے پس منظر میں ذہن انسانی کی وہ پوری تاریخ ہے جس نے انسان کو مذہبی اور اخلاقی اقدار (Values) کا محافظ اور امین بنایا ہے اور جس کے ارتقاء اور ارتفاع میں فکر و جذبہ یا عقل و عشق دونوں نے اپنا نمایاں حصہ ادا کیا ہے اور مادی زندگی کی فتوحات میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ مگر جب حقیقت (Reality) یا صداقت (Truth) کے اسرار و رموز کے عرفان کی منزل آتی ہے تو عقل (Reason) کے قدم رک جاتے ہیں اور جذبہ یا عشق (Love or Intuition) ہی اس منزل میں کامران بن کر داخل ہوتا ہے۔ مختصراً یوں کہ جذبہ یا عشق ہی کا یہ کمال ہے کہ انسانی وجود، وجود مطلق (Absolute Existence) کا رازداں بن جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی عالمی مذہبی فکر کا امتیازی وصف یہی ہے کہ وہ انسانی وجود کو اپنے سفر کا نقطۂ آغاز بناتی اور خدا تک پہنچتی ہے۔ اسی لئے یہ اس کی منزل ہے۔ لہٰذا اقبال کے نزدیک یہ سفر معدوم سے موجود تک نہیں بلکہ موجود سے وجود تک ہے۔ اسلام میں انسان کا یہ تصور ابتدا سے موجود تھا۔ رسول اللہ صلعم کی ایک "شان" انسان تھے "انی بشر مثلکم" (میں تمھاری طرح انسان ہوں) سے یہ بات نمایاں ہو جاتی ہے کہ پیغمبر حق مرتبت نے اپنی عبدیت کو نبوت پر ہمیشہ مقدم رکھا۔ حاصل یہ کہ انسان کے مرتبے، اس کی منزلت اور عظمت

کو اسلام نے عام کیا۔ وہ مخلوقات میں سب سے اشرف و افضل ہے اور اس کی ذات خدائی صفات کا عکس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ اور شعور کی قوت ودیعت کی ہے تاکہ وہ خیر و شر کی تمیز کر سکے۔ اقبال نے اپنی شاعری اور فلسفیانہ فکر سے خدا، کائنات اور انسان کا جو باہمی ربط و تعلق واضح کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے نزدیک حق (Truth) آدم (Man) اور عالم (Universe) باہم مربوط ہیں۔ عالم، حق کی صفات کا عکس اور آدم خدا کی ذات کا عکس ہے۔ یوں تو کائنات خدا تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ مگر نائب ہونے کی عظمت سے یہ اس کی (آدم کی) میراث ہے اور اسے مکمل طور سے اس پر تصرف کا حق حاصل ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان اور انسانیت کا وسیع تر تصور ہے جس میں انسانیت آدمی کے احترام سے عبارت ہے اور آدمی کے عظیم مقام سے باخبر ہونا ہی اقبال کی فکر کا مطمع نظر ہے۔

آدمیت احترام آدمی — باخبر شو از مقام آدمی
برتر از گردوں مقام آدم است — اصل تہذیب احترام آدم است
وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا — ہر قطرہ ہے بحر بیکراں

مغربی علوم کی ترقی میں مسلمانوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ علمی صداقتیں اور نظریات آفاقی ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے جب اس میراث کو ترک کیا تو وہ نہ صرف ذہنی اور علمی طور پر بلکہ سیاسی اور معاشی طور پر بھی پسماندہ ہوتے چلے گئے اور اس طرح انھوں نے اپنے ادبار و انحطاط کا مداوا تصوف کی پناہ گاہ میں ڈھونڈا۔ اقبال حقیقی تصوف کے تصور کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ وہ اس سے لئے گئے غلط تصورات کی نقطہ چینی کرتے ہیں اور انھیں اسلام کے منافی سمجھتے ہوئے یکسر رد کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک تصوف، خصوصاً نظریہ وحدت الوجود مسلمانوں میں ترک عمل اور دنیا گریزی کا سبب بنا۔ اسی لئے انھوں نے ابتدا میں ابن عربی پر تنقید بھی کی۔ اس کے مقابلے میں انھوں نے ان نظریات پر زور دیا جن میں بقا کا تصور اور خودی کو مستحکم کرنے پر زور تھا۔ اور جن نظریات کو مولانا روم اور شیخ احمد سرہندی نے اپنایا۔ مولانا روم نے تخلیق کائنات و تخلیق آدم و انسانی کمال کے ممکنات کی نئے انداز میں تشریح کی۔ مسئلہ ارتقا پر رومی نے جس زاویہ سے روشنی ڈالی ہے اس سے فنا اور بقا

کا مسئلہ نئی جہت حاصل کر لیتا ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ کسی چیز کے فنا ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ سرے سے معدوم ہو جائے بلکہ ایک ادنیٰ حالت سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرنے کیلئے ضروری ہے کہ موجودہ صورت فنا ہو جائے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"پہلے تم جماد تھے پھر تم میں قوت نمو پیدا ہوئی، پھر تم میں جان آئی، پھر عقل و تمیز، پھر حواس خمسہ کے علاوہ اور حواس حاصل ہوئے، تو جسم کی بقا پر کیوں جان دیتے ہو۔ نیا لو، پرانا چھوڑ دو، کیونکہ تمھارا ہر سال پار سال سے اچھا ہے۔"

(سوانح عمری مولانا روم۔ ترجمہ فارسی اشعار)

اس طرح انسانی زندگی نیچے بقا کا درجہ پاکر اپنی منزل مقصود یعنی درجۂ کمال تک جا پہنچتی ہے۔ خودی کا تحفظ، تکریم حیات، تحقیق ذات، تسخیر کائنات اور عروج آدم اقبال کی طرح رومی کے خاص موضوع ہیں۔ رومی کو ہمیشہ انسان کی تلاش رہی۔ اس سلسلہ میں مولانا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زین ہمرہان سست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اقبال کو رومی کا جذب و سرور، ان کی سرمستی، عالمگیر جذبۂ انسانی، ان کا ذوق و شوق، ان کا انا کا تصور، ان کی قلندرانہ جرات انکار و گفتار، انسان، خدا اور کائنات کے بارے میں ان کا اجتہادی نقطۂ نظر، ان سب نے اقبال کو متاثر کیا ہے اور اسی وجہ سے انھوں نے اپنے آپ کو مولانا رومی کا مرید بنایا۔ ارمغان حجاز میں اقبال کہتے ہیں:

گرہ از کار این ناکارہ واکرد — غبار رہگذر را کیمیا کرد

(یعنی رومی نے اس خاکسار کی زندگی کی گتھی کو سلجھایا اور جو راستے کا غبار تھا اسے کیمیا کر دیا)

سائنسی اور علمی ترقی کے باوجود مغرب زوال (Decline) کی جانب کیوں مڑتا گیا؟ اسکا جواب اقبال یوں دیتے ہیں کہ جب مغرب کا روحانی و اخلاقی اقدار سے تہی دامن ہونا شروع ہوا تو آہستہ آہستہ زوال اس کا مقدر بنتا گیا، کیونکہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے زندگی کے مادی پہلوؤں پر اتنا زور دیا کہ انسانی عظمت، روحانی اور اخلاقی اقدار پس پشت

چلے گئے۔ اس طرح تہذیب ایک رُخی ہوتے ہوئے روحانی انحطاط کا شکار ہو گئی۔ اقبال نے اپنے ذاتی مشاہدے اور مغربی مفکرین جیسے اسپنگلر (Spengler) اور نطشے (Nietzsche) کے حوالے سے جو اشارے کئے ہیں وہ صاف طور سے اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ مغربی ممالک کی اس روحانی بیماری کا بنیادی سبب کسی ایسے نظریے کا فقدان ہے جو انسان، اس کی خودی اور انسانیت کا تحفظ اور کامیاب تصور دے سکے۔ مغرب کی اس روحانی دوری پر اقبال "ضربِ کلیم" میں یوں فرماتے ہیں:

پیشِ فراواں، یہ حکومت، یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محرومِ تسلّی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیِ ایمن نہیں شایانِ تجلّی

اسی ضمن میں ایک اور جگہ یوں ہم کلام ہیں:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

اسی طرح مشرق کی کورانہ تقلید، غلامی اور نفیِ خودی کے رجحانات کو بھی اقبال نے جانچا اور ان سب سے انسانی خودی پر ہونے والے دور رس مضر نتائج کا ادراک کیا۔ گویا انسانی "انا" کی عظمت و تکریم اور شان و شوکت کو کوئی بھی سمت برقرار نہ رکھ سکی۔ خودی (Selfhood) کی پستی کی اس مرض کی وجوہ کو اقبال مشرق و مغرب میں یوں تلاش کرتے ہیں:

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری
مشرق حق را دید و عالم را ندید
غرب در عالم خزید از حق رمید

اسی سلسلہ میں "ضربِ کلیم" ہی میں ایک اور جگہ یوں لکھتے ہیں:

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

اقبال کے تصورِ انسانیت اور اس سے متعلق فکر کے مختلف گوشوں کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مشرقی اور مغربی فکر کے ان ماخذوں کا سرسری طور سے ذکر کیا جائے جنھوں نے علامہ کو متاثر

کیا اور ان کی فکر میں مماثلت کا پتہ چلایا جائے جن کا موضوع "انسانی فکر" اور اس کا ارتقاء رہا ہے۔ اقبال خاص طور سے جن مکاتیبِ فکر سے متاثر ہوئے ان میں اسلامی فکر، ہندوستانی فکر، زرتشتی فکر اور مغربی فکر قابلِ ذکر ہیں۔ اسلامی فکر میں اقبال قرآن کو اپنے فلسفے کا بنیادی ماخذ مانتے ہیں اور احادیث رسول ؐ اور چند علماء و صوفیائے کرام کو، جنھوں نے قرآن کی روشنی میں انسان اور وجودِ انسانی کو اجتہادی طرز میں پیش کرنے کی تعبیر و تفسیر کی ہے، نمایاں اہمیت دیتے ہیں۔ ان میں حضرت جنید بغدادی، ابن عربی، الجیلی، شہاب الدین سہروردی، خواجہ میر درد، جلال الدین رومی، غالب، مرزا عبد القادر بیدل اور علامہ النظام، الغزالی، طوسی، شاہ ولی اللہ، جلال الدین دوانی، ملا باقر، جاحظ، ابن مسکویہ، ابن رشد، حلاج وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مغربی فکر میں جن اہم شخصیات سے اقبال متاثر ہوئے ان میں خاص طور سے کانٹ (KANT)، فشٹے (FICHTE)، شوپنہار (SCHOPEN HAUER)، برگساں (BERGSON) اور نطشے (NIETZSCHE) قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے زینو، افلاطون، نیوٹن، ہیگل، گوئٹے، آئن سٹائن (EINSTEIN)، کینٹر (CANTOR)، جیمس جینس (JAMES JEANS)، اسپنگلر (SPENGLER)، ولیم جیمس (WILLIAM JAMES)، سی۔ ڈی۔ براڈ (C.D. BROAD) اور آرنلڈ (ARNOLD) وغیرہ مفکرین سے استفادہ کیا۔ اسی طرح زرتشتی فکر سے بھی علامہ کو کافی متاثر کیا جس کا ثبوت ان کے تحقیقی مقالہ "فلسفۂ عجم" میں اس فکر کی تشریح سے ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستانی مکتبِ فکر کے جن اہم مفکرین نے علامہ پر اپنا اثر چھوڑا ان میں گوتم بدھ، سری کرشن جی (جن کی بھگوت گیتا کا فلسفۂ عمل)، وشوامتر، بھرتری ہری، اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے اہم مفکرین رابندر ناتھ ٹیگور، ڈاکٹر رادھا کرشنن، اروبندو گھوش خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

اقبال کی شاعری اور فکر کا سب سے اہم موضوع مقامِ بشریت اور عروجِ آدم ہی ہے۔ لہٰذا انھوں نے ان سب مختلف راہوں اور گوشوں کی تلاش و جستجو کی جو عروجِ آدم کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ انسان کے صحیح مقام PROPER PLACE

کے متبعین میں وہ مشرق و مغرب کے مفکرین سے متاثر ضرور ہوئے مگر خداداد فکر و خیال کی وسیع اقلیم کے وہ مقلد نہیں بلکہ مجتہد بن کر نکلے یعنی انھوں نے اپنی شاعری اور فکر کو نئے افق نئے زاویے اور نئی جہتیں دے کر اپنے لیے ایک راہ دریافت کی۔ اس طرح انھوں نے انسان کی "وجودی" اور "مابعد الطبیعیاتی" قدر و منزلت (EXISTENTIAL & META-PHYSICAL VALUE) کو نئے طرز اسلوب سے سامنے رکھ کر خود شناسی اور حق شناسی کی اہمیت و وقعت کو واضح کیا۔

کلام اقبال کا بغور مطالعہ کرنے سے ہمیں ان اہم موضوعات کا پتہ چلتا ہے جنکو انھوں نے خاص طور سے اہمیت دی۔ ان میں خصوصاً خدا، انسان، کائنات اور ان کا باہمی رشتہ، انسانی عظمت اور نیابت الٰہیہ کے اوصاف، علم افضل، جبر و اختیار، عشق و محبت، صبر و استغنا، کائنات کا مقصد، مقصد زندگی، حسن اخلاق کی اہمیت وغیرہ قابل ذکر ہیں مگر یاد رہے کہ انسان اور اس کی خودی (SELFHOOD) کو اس نے ہر تصور (CONCEPTION) کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل سمجھا ہے۔ حقیقت اولیٰ تک اسی کی رسائی ہو سکتی ہے جو حقیقت انسانی کی معرفت رکھتا ہے۔ اس طرح اقبال امیرالمومنین حضرت علی کے قول مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچان لیا) کو اپنی شاعری و فکر کا مشعل راہ بنا کر خودی کے اسرار و رموز کو منکشف کیا۔ کلام پاک کی آیت "اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَة" سے صاف واضح ہے کہ انسان مخلوقات میں صرف اشرف ہی نہیں بلکہ وہ منصب خلافت، رموز و فی عرض السماء والارض اور کائنات کی امانت داری کے عظیم مرتبہ پر فائز بھی ہے۔ یہ شرف اور فضیلت روز ازل سے ہی اس کا مقدر بن چکی ہے۔ اس طرح انسان نے جب فلکی فضاؤں سے نکل کر پہلی بار زمین پر قدم رکھا تو روح ارضی نے بڑھ کر اسکا استقبال کیا، اور اس کی نظروں کو مظاہر کائنات کا مشتاق بنایا کہ وہ آئینہ ایام میں اپنی خودی کی صلاحیتوں کے امکانات کی جھلک دیکھ سکے۔ "بال جبریل" میں اقبال اسکا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں — یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں — تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے — دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے — پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر، اثر آہ رسا دیکھ

بس یہی "تعمیر خودی" اقبال کے نام و پیغام کو عام کرتی ہے۔ یہی دین و دنیا کی اثاث ہے اور جب علم، معاملہ اور مکاشفہ کی اثاث ایک ہو تو اس میں کوئی دوئی نہیں رہتی اور انسان مشیت ایزدی کی ودیعت کردہ ان گنت صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنی خودی کو مستحکم کر سکتا ہے۔ اصل میں اقبال اسی تعمیر خودی میں خدائی سمجھتے ہیں:

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی — خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش — خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

اقبال کے نزدیک پوری کائنات انسانی خودی کا مظہر ہے، تمام حرکات و سکنات اسی کی ذات سے عمل و عبارت ہیں۔ اپنی فارسی مثنوی "اسرار خودی" میں اسی ضمن میں فرماتے ہیں:

پیکر ہستی ز آثار خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چون خودی بیدار کرد — آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او — غیر او پیداست از اثبات او
چون حیات عالم از زور خودی است — پس بقدر استواری زندگی است

اسی ابن آدم کو، جو کہ علم الٰہی سے فیضیاب اور عرفان ذات (خودی) کی دولت سے مالا مال ہے اقبال اپنی شاعری اور فکر میں اسے "انسان کامل" (PERFECT OR SUPER MAN) یا "مرد مومن" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ انسانی خودی یا شخصیت (PERSONALITY) کو محکم و مستحکم کرنے اور اس کی انفرادی و اجتماعی تعمیر و ارتقاء کیلئے جو عناصر و شرائط ضروری ہیں ان میں خاص طور سے عشق، فقر، استغنا، صبر و قناعت، جرأت، حریت، کسب حلال، اثبات حیات اور ذوق تسخیر یعنی تخلیقی جذبہ، تسخیر کائنات اور عروج آدم، بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اقبال

کے نزدیک "مردِ مومن" اعلیٰ اوصاف کا مالک ہے لہٰذا اس کی شخصیت کو سمجھنے پرکھنے کے لئے بہتر ہوگا کہ سرسری طور سے ان عوامل کا جائزہ لیا جائے۔ تاکہ اقبال کے "مردِ مومن" کے تصور کو آسانی سے سمجھا جا سکے۔

(۱) خودی و عشق جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ خودی کا تصور اقبال کے فلسفۂ حیات کا اہم کی بنیاد ہے۔ تعلیمات اسلامی کی روشنی میں اقبال کا یہ خیال ہے کہ انسان بے پناہ توانائیوں اور لامحدود صلاحیتوں کا سرچشمہ ہے اور یہ سب انسانی خودی میں پوشیدہ رہتی ہیں۔ اگر انسان اپنے نفس یا ذات کا عرفان حاصل کرے اور اپنی تخلیقی قوتوں کو عملی جامہ پہناتے ہوئے بشریت کے اعلیٰ مدارج کی جانب بڑھنا شروع کرے تو وہ "انسانِ کامل" (PERFECT MAN) کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے اور عشق اقبال کے نزدیک بنیادی جذبۂ حیات ہے۔ انسانی خودی یا انا (EGO) حیات کی اعلیٰ سطحوں پر خودیِ مطلق (ABSOLUTE EGO) سے ملنے اور قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لئے بے چین رہتی ہے لیکن یہاں قابلِ ذکر ہے کہ اقبال کے نزدیک انسانی خودی، خودیِ مطلق سے مل کر اپنی ذات کو فنا نہیں کرتی بلکہ اسے برقرار رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال نے ابنِ عربی پر جن کے متصوفانہ فلسفے، جس کا دار و مدار عقیدۂ وحدت الوجود پر تھا، تنقید کی اور ان سب صوفیا سے اختلاف کیا جو تصوف کے زیرِ اثر فنائے ذات اور نفیِ خودی کے مسلک کی تلقین کرتے یا عمل کرتے تھے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ "مردِ مومن" جس کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں اور جو مظہرِ ذاتِ مطلق ہے اس کی خودی کو خودیِ مطلق میں جا کر ضم و فنا نہیں ہو جانا چاہیے۔ جس طرح رسول اکرمؐ ایک مثالی انسان (مردِ مومن) ہونے کی حیثیت سے اپنی عبدیت کو فوقیت و اہمیت دیتے ہیں وہ اسے برقرار رکھتے ہیں۔ اسی طرح اقبال بھی خودی کی بقا و استحکام پر زور دیتے ہیں۔ تاہم علامہ اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ "مردِ مومن" کی خودی میں اس قسم کا جوہر موجود ہونا چاہیے جس سے ذاتِ مطلق کے قریب پہنچ کر اس کی رضا کو اپنی مرضی بنا سکے۔ اقبال غزالی سے اس سلسلہ میں اتفاق کرتے ہیں کہ انسان عقل اور عشق کے ذریعہ حقیقت تک رسائی کر سکتا ہے۔ اقبال کے یہاں عقل (REASON) اور عشق (LOVE) دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ عقل حقیقت (REALITY) کو ٹکڑے ٹکڑے (PIECE MEAL) پاتی ہے اور عشق یا وجدان (INTUITION) کے کُل جلوہ کو بے نقاب کرتا ہے گویا اقبال کے نزدیک عشق ہی حقیقت تک پہنچنے اور اس کے اسرار و رموز جاننے کا ذریعہ ہے جو عقل سے ممکن نہیں۔ یہ عشق ہی ہے جو مردِ مومن کی خودی کو استوار اور مستحکم کرتا ہے۔ حیات کا ارتقا سوز و ساز پر موقوف ہے۔ خودی کی تعمیر اور استحکام میں عشق نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلہ میں کلامِ اقبال سے فارسی اور اردو میں چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

از محبت چوں خودی محکم شود ۔۔۔ قوتش فرماندۂ عالم شود
نقطۂ نورے کہ نام او خودی است ۔۔۔ زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر ۔۔۔ زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر
عاشقی محکم شو از تقلیدِ یار ۔۔۔ تا کمندِ تو شود یزداں شکار

اگرچہ حقیقت کی تلاش میں عقل عشق کی رفیق ہے مگر عقل میں وہ جرأتِ رندانہ نہیں ہے جس سے وہ منزلِ مقصود پا سکے۔ اقبال عقل و عشق کا موازنہ یوں کرتے ہیں:۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق ۔۔۔ عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام ۔۔۔ اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں
عقل ہم عشق است و از ذوقِ نظر بیگانہ نیست ۔۔۔ لیکن این بیچارہ را آں جرأتِ رندانہ نیست
عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے ۔۔۔ عشق بیچارہ نہ ملا ہے، نہ صوفی، نہ حکیم

عشق کی بدولت "مردِ مومن" تخلیق و عمل کو فروغ دے سکتا ہے اور اسی سے وہ حیات جاوید پاتا ہے۔ بالِ جبریل میں اقبال فرماتے ہیں:۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ ۔۔۔ عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ ۔۔۔ عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات ۔۔۔ عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

(باقی آئندہ)

غزلیں

عطا عابدی، دربھنگوی

مدرس مدرسہ چشمۂ فیض ملّی کیلو ہی، دھونی

(بہار)

نہ بیچیں گے کبھی یہ دیدۂ پرنم نہ بیچیں گے
کبھی ہم وقت کے ہاتھوں تمھارا غم نہ بیچیں گے
جھلکتی ہیں مرے اجداد کی تابانیاں اس میں
کسی صورت ہم اپنی قوم کا پرچم نہ بیچیں گے
جو دامن پھونک دیتے ہیں بوقتِ شام کھیتوں میں
کسی قیمت بھی ہم وہ قطرۂ شبنم نہ بیچیں گے
کہیں بہر حقائق کے کہیں ہم رت جگے کر دیں
سحر ہوتے ہوئے بھی خواب کا عالم نہ بیچیں گے
ہماری جان بھی چاہے کوئی لے لے عطا لیکن
متاعِ فکر و فن، لوح و قلم تا دم نہ بیچیں گے

تابش مہدی

(دیوبند، یوپی)

کچھ تو دنیا سے لے کے جائیے
ہم فقیروں کی دعا لے جائیے
اور تو کچھ بھی نہیں دل کے سوا
جو بھی ہے اچھا برا لے جائیے
صرف امیدِ وفا پر عمر بھر
آستیں میں سانپ پالے جائیے
فطرتاً کوئی برا ہوتا نہیں
جس کو جیسا بھی بنا لے جائیے
تاکہ میں خود سے بھی پوشیدہ رہوں
پردہ آئینہ پہ ڈالے جائیے
اس ستمگر کے جو بھیجے ہو چلے
یوں نہ زخموں کو چھپا لے جائیے
ہو سکے تو اُس کی چوکھٹ کے لیے
سجدۂ دل آشنا لے جائیے

غزل

حفیظ میرٹھی

پکارا ہے انھیں شاہد قضا نے
پرندے جھیل پر آئے نہانے
ہمارا راستہ جس نے بھی روکا
اسے شاباشیاں دیں رہنما نے
ستم کو وہ کرم ثابت کریں گے
ذہانت ان کو بخشی ہے خدا نے
یہ کہہ کر شیخ کو ساقی نے چھیڑا
ہمارے قدرداں ہیں یہ پرانے
نقابوں کے، حجابوں کے تکلف
اٹھا ڈالے زمانے کی ہوا نے
اٹھی کردار کی جب پاسبانی
ہوئے بدنام باعزت گھرانے
کہو کچھ تو کہو خاموش کیوں ہو
بہت ہیں بے وفائی کے بہانے
نہیں لیتے غریبوں کے سلام اب
انھیں جو بکا دیا ہے التجا نے
وہ دیکھو آ گئے رہبر ہمارے
ہمیں آدابِ مظلومی سکھانے
حفیظ اب قوم بھی بچتی یہی ہے
کہ مسجد میں بتوں کے ہوں ٹھکانے

غزل

اختر اعظمی جلالپوری

ہم نے مانا کہ ابھی گرمیِ انکار بھی ہے
ان کے مکتب میں کوئی صاحبِ اسرار بھی ہے؟
وہ گھڑی جو کہ ابھی مائلِ اقرار بھی ہے
اُنکے اقرار سے اندازۂ انکار بھی ہے
آج احساس طبیعت ذرا بیدار بھی ہے
لب پہ اظہار تبسم سے گہربار بھی ہے
گلشنِ ہند میں اس طور سے آئی ہے بہار
شاخِ گل فرحِ مسرت سے ثمربار بھی ہے
شام ہوتے ہی کلی چپکے سے نکل جاتا ہے
پارسا ہو کے بظاہر وہ گنہگار بھی ہے
پاؤں میں فرطِ محبت سے جو لگ جاتا ہے
گل کے پہلو میں نکلتا ہوا اک خار بھی ہے
مار ڈالا ہے زمانے کے غموں نے یکسر
سایہ افگن مرے سر پر تری تلوار بھی ہے
ہم نے مانا کہ حکومت ہے مخالف اس کی
کوئی اُردو کا زمانے میں طلبگار بھی ہے
آگیا دورِ گلستاں یہاں سر آستر
مائلِ رحم و کرم اب مری سرکار بھی ہے

از: جمیل احمد نوری شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی
(علی گڑھ)

رشید الدین فضل اللہ ایک عظیم ایرانی مورخ

سلاطین ایلخانی کے دورِ حکومت میں جن ادیبوں، عالموں، مفکروں اور مورخوں کو شہرتِ دوام کی دولت حاصل ہوئی ان میں خواجہ رشید الدین فضل اللہ کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے مشہور مستشرق پروفیسر ایڈورڈ براؤن اپنی تاریخ ادبیات ایران میں لکھتے ہیں۔

"خواجہ رشید الدین فضل اللہ وزیر است کو در علم طب و مملکت مداری و تاریخ و نیکوکاری سرآمد اقران بود" [1]

اسی سے ملتا جلتا تاثر رضازادہ شفق کا ہے وہ اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران میں رقمطراز ہیں۔

"خواجہ رشید الدین فضل اللہ وزیر غازان از دانشمندان و طبیبان و مورخان زمان خود بود و در عقل و تدبیر نظیر نداشت" [2]

ایران کے مشہور ادیب و محقق ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی یہ رائے بھی بڑی وقعت کی حامل ہے۔

"وی تنہا وزیری مدبر نبود بلکہ محیی آثار پیشینیان و بانی آثار جدید و مولف نامدار و مورخ کم نظیر و دانشمند گرانقدر و نویسندۂ فاضل و مرد بزرگوار بود و علاوہ بر آن کہ درگاہش ملجاء و مآب اہل علم و ہنر بود" [3]

۱۔ تاریخ ادبیات ایران از سعدی تا جامی ترجمہ فارسی از علی اصغر حکمت مطبوعہ تہران ۱۳۵۱

۲۔ تاریخ ادبیات ایران از رضازادہ شفق مطبوعہ ایران

۳۔ تاریخ ادبیات در ایران از ذبیح اللہ صفا جلد سوم مطبوعہ تہران

مذکورہ بالا اقتباسات سے اس کے علم و فضل اور استعداد و کمال کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے وہ اپنے دور کا یکتا "ایک مایہ ناز ادیب، عظیم مورخ، بے مثل طبیب اور کامیاب وزیر تھا، اس نے ایک لمبی مدت تک نہایت خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ وزارت کے عظیم ترین فرائض انجام دئے اس کی یہ اہمیت و فضیلت کسی طرح بھی کم نہیں ہے کہ وہ بیک وقت ایک بہترین، ممتاز اور کامیاب منتظم حکمران اور وزیر ہے اور دوسری طرف علم و ادب اور فن و حکمت کے میدان کا شہسوار بھی حالانکہ تحقیق و تصنیف اور علمی مشغل کے لئے جس سکونِ دل اور طمانیتِ قلب کی ضرورت درکار ہے وہ سلطنت و حکومت کے انتظام و انصرام میں ہرگز نہیں مل پاتا مگر اس کے باوجود رشید الدین فضل اللہ کی ذات میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں وہ ایک جانب حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز تھا اور دوسری جانب تصنیف و تالیف کے میدان میں گامزن تھا اور مختلف علوم و فنون پر نہایت چابکدستی اور قابلیت کے ساتھ کتابیں لکھتا تھا۔ اس کی کتابیں اسلوب نگارش، انداز بیان اور طرز ادا کے اعتبار سے اپنے دور کی فارسی ادبیات کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔

سنہ پیدائش میں اختلاف ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ سنہ ۶۴۵ھ سنہ ۱۲۴۷ع میں ہمدان میں پیدا ہوا تحصیل علوم کے بعد سلطان اباقاخان کے دربار سے وابستہ ہوا پھر جب سنہ ۶۹۵ھ میں سلطان غازان خان تخت نشین ہوا تو رشید الدین فضل اللہ اس کے دربار سے وابستہ ہوئے اور اپنی استعداد و صلاحیت سے سلطان کا اس قدر اعتماد حاصل کیا کہ جب وزیر اعظم صدر الدین زنجانی معزول ہوئے تو غازان خان نے خواجہ رشید الدین فضل اللہ اور خواجہ سعد الدین دونوں کو صدارت کے عہدے پر مامور کیا جب تک غازان خان زندہ رہا رشید الدین فضل اللہ اس کے دربار میں نہایت اثر و رسوخ کا حامل اور سلطان کا نہایت معتمد رہا غازان خان کے بعد جب اولجایتو کو حکومت ملی تو یہ اس کے دربار سے وابستہ ہوا اور اپنے تدبر، ذہانت، استعداد و صلاحیت اور حسن کارکردگی سے اولجایتو کے دربار میں بھی عظیم قدر و منزلت حاصل کی انہیں ایام میں سلطانیہ میں ایک بستی رشیدیہ کے نام سے آباد کی جس میں عالی شان مسجدیں مدرسے شفاخانے اور

تقریباً "ایک ہزار مکانات تھے۔ اس کے دو سال کے بعد ایک دوسرے مقام پر ربع رشیدی کے نام سے ایک دوسری بستی کی بنیاد ڈالی یہ سارا تعمیری کام سلطان اولجایتو کا مرہونِ کرم ہے چنانچہ خواجہ رشید الدین فضل اللہ نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ "سلطان نے مجھ کو جس قدر انعام و اکرام سے نوازا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔" ۱۳۱۲ء کے شروع میں خواجہ سعد الدین، خواجہ علی شاہ کی ریشہ دوانیوں کے باعث قتل کر دیا گیا خواجہ سعد الدین کے قتل کے بعد خواجہ علی شاہ اس منصب پر فائز ہوا اس واقعہ کے بعد خواجہ علی شاہ نے خواجہ رشید الدین فضل اللہ کے بارے میں ایک خطرناک چال چلی مگر خوش قسمتی سے رشید الدین، فضل اللہ محفوظ رہا۔ بالآخر خواجہ علی شاہ اور خواجہ رشید الدین فضل اللہ کے درمیان شدید اختلاف رونما ہوا بادشاہ وقت سلطان اولجایتو نے مجبور ہو کر ایران اور ایشائے صغیر کے ممالک الگ الگ طور پر ان دونوں میں تقسیم کر دیئے تاکہ بعد میں کوئی اختلاف پیش نہ آئے مگر یہ رقابت اور دشمنی سلطان اولجایتو کے انتقال کے بعد سلطان ابو سعید کے زمانے میں بھی برقرار رہی یہاں تک کہ خواجہ رشید الدین فضل اللہ ۱۳۱۷ء میں اپنے عہدے سے سبک دوش ہو گیا اور بالآخر ۱۸ جنوری ۱۳۱۸ء کو اس کے سولہ سالہ بیٹے ابراہیم اور اس کو سلطان سابق اولجایتو کو زہر دینے کے الزام میں قتل کر دیا گیا اور تمام جائداد ضبط کر لی گئی صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ خواجہ رشید الدین فضل اللہ کے متعلقین اور ان کے وابستگان کو بھی قید و بند اور عقوبت سے گزرنا پڑا ربع رشیدی جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اس کو تاخت و تاراج کر دیا گیا یہاں تک کہ اس کی تمام یادگار مٹا دی گئی رقابت و حسد کا یہ سلسلہ یہیں نہیں ختم ہوا بلکہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔ اس کی وفات کے ایک سال کے بعد میران شاہ نے اس کی قبر کھدوا کر اس کی نعش یہودیوں کے قبرستان میں منتقل کر دی اور اس طرح اس نے وہ ننگِ انسانیت کارنامہ انجام دیا جو شرافت و آدمیت کے قطعاً خلاف ہے اس سانحہ کے بعد سنہ ۱۳۲۴ء میں خواجہ علی شاہ بھی انتقال کر گیا۔

ذیل میں خواجہ رشید الدین فضل اللہ کی تصنیفات کا بالترتیب ذکر کیا جاتا ہے

سب سے اہم تصنیف جو اس کا شاہکار ہے جامع التواریخ ہے یہ کتاب سلطان غازان خان کی فرمائش پر معرضِ وجود میں آئی سلطان نے یہ خیال کر کے کہ مغل قوم جس کو آج تفوق و برتری حاصل ہے امتداد زمانہ سے وہ ایرانی عنصر میں شامل ہو جائے گی اور اس کی انفرادیت ختم ہو کر رہ جائے گی اس لئے ایک ایسی تاریخ بطور یادگار چھوڑی جائے جس میں اس قوم کے حسب و نسب، سوانح حیات، اخلاق و عادات، رسوم و آداب، حیرت انگیز و تفاخر کارنامے غرض کی تفصیلی حالات کا ذکر ہو اس عظیم کام کے لئے سلطان نے خواجہ رشید الدین فضل اللہ کا انتخاب کیا اور حسن اتفاق کہ اس سے بہتر انتخاب بھی ممکن نہ ہو سکتا رشید الدین فضل اللہ اگرچہ اس قدر وسیع و عریض سلطنت کے انتظام و انصرام میں مصروف رہتا تاہم کتاب کی تاریخی تحقیق و تصنیف کے لئے وقت نکالتا تذکرہ دولت شاہ سمرقندی[1] میں لکھا ہے۔

"و فکتابت این تاریخ از دم صبح بعد از ادای فرائض و بعضی اوراد تا طلوع آفتاب بود چون در اوقات دیگر فراغت بواسطۂ امور ملکی و اشغال دیوانی میسر نبود۔"

جامع التواریخ ابھی پایۂ تکمیل کو بھی نہ پہنچی تھی کہ سلطان غازان خان کا ۱۳۰۴ء میں انتقال ہو گیا مگر اس کے جانشین سلطان اولجایتو نے اس کو مکمل کرنے اور سلطان غازان خان کے نام منسوب کرنے کا حکم دیا اسی لئے اس کتاب کی جلد اول تاریخ مغول پر مشتمل ہے جلد دوم میں تاریخ عالم عموماً اور تاریخ عالم اسلامی بطور خاص مذکور ہے جلد سوم جغرافیہ کے مسائل کے بیان میں ہے لیکن آخری جلد ضائع ہو چکی ہے۔

۲۔ **الاحیا و الآثار** ۔ یہ کتاب ۲۴ جلدوں میں ہے اور مختلف علمی مسائل پر مشتمل ہے یہ کتاب بھی ضائع ہو چکی ہے۔

۳۔ **توضیحات** ۔ یہ کتاب سلطان الجایتو کی فرمائش پر تحریر کی گئی ہے اس میں تصوف اور علم کلام کے مسائل کا ذکر ہے۔

۴۔ **مفتاح التفاسیر** ۔ یہ کتاب مختلف علمی موضوعات پر ہے جیسے فصاحت قرآن، مفسرین قرآن، خیر و شر، جزا و سزا، طول عمر، پروردگار، تقدیر اس کتاب کے آخر میں

۱۔ تذکرہ دولت شاہ سمرقندی مطبوعہ لیدن بکوشش براون ص ۲۱۰

ایک فصل تناسخ کے رد میں بھی ہے۔

۵- السوالات السلطانیہ۔ اسی مضمون کی ایک دوسری کتاب ہے اور ان بحثوں کا خلاصہ ہے جو سلطان اولجایتو کے دربار میں علماء میں ہوا کرتی تھیں۔

۶- لطائف الحقائق۔ یہ کتاب علم کلام پر ہے اور ان خوابوں کی تشریح ہے جو مولف نے دیکھے ہیں۔

۷- بیان الحقائق۔ علم کلام کے مسائل کا ذکر ہے نیز اس کتاب میں طب اور اس کے متعلق علاج کا بیان ہے۔

ان مذکورہ کتب کے علاوہ اس کے علمی کارناموں میں اس کے وہ رقعات اور مکاتیب بھی شامل ہیں جو اس نے اپنے دور کے علماء و مشائخ، اعزہ و اقارب اور اپنے عزیز فرزندوں کو تحریر کئے ہیں اور جن کو ابرقوہی نام کے ایک شخص نے جمع کیا ہے۔ یہ مکتوبات زبان و بیان، طرز ادا اسلوب نگارش کے اعتبار سے اپنے دور کی فارسی نثر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ عربی و فارسی کے اشعار، امثال و حکم، صنائع بدائع کا استعمال بکثرت ہے مندرجات کے لحاظ سے اخلاق و عادات، پند و نصیحت اور نظم و ادب کے مضامین ہیں۔

خواجہ رشید الدین فضل اللہ نے اپنی تصنیفات کو حوادث زمانہ کی دستبرد سے بچانے کے لئے تمام ممکنہ وسائل و ذرائع استعمال کئے مثلاً اس نے اپنی ہر تصنیف کی ایک ایک کاپی نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین اور خوشخط کاتبوں سے لکھوا کر مختلف مقامات پر علماء و ادباء کے پاس روانہ کی اس کے علاوہ ربع رشیدی میں بھی ہر ایک کتاب کی ایک ایک کاپی محفوظ کرادی تاکہ یہ تمام کتابیں محفوظ رہیں اور ضائع نہ ہونے پائیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گردش زمانہ کے نزدیک ان باتوں کا کوئی اعتبار نہیں بسا اوقات غیر محفوظ اشیاء محفوظ بھی رہیں اور ضائع نہیں ہوتیں اور کبھی غیر معمولی حزم و احتیاط اور غیر معمولی حفاظت کے باوجود زمانہ کی دستبرد کا شکار ہو جاتی ہیں۔

ایڈیٹر

نئی تعلیمی پالیسی اور اس کے اثرات

عام طور پر انسان کی تین بنیادی ضرورتیں بیان کی جاتی ہیں۔ روٹی، کپڑا، اور مکان۔ انسانی وجود کو برقرار رکھنے کے لئے روٹی یعنی غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کے پوری ہونے کے بعد انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ ننگا ہے۔ اس کو اپنا ستر چھپانا چاہئے اور کپڑے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور اس کے بعد اس کو ایک گھر کی ضرورت ہوتی ہے جس میں وہ سکون سے رہ سکے اور گرمی، سردی، بارش، لو ہر چیز سے محفوظ رہ سکے۔ اگر ہم ذرا غور سے اس دنیا کو دیکھیں اور اس کا جائزہ لیں تو یہ بات بہت جلد کھل جاتی ہے کہ دنیا کا پورا نظام انھیں تین چیزوں روٹی، کپڑا، اور مکان کے گرد چکر لگا رہا ہے اور دنیا کی تمام حکومتیں اسی کے گرد گھوم رہی ہیں۔ ان کا معاشی نظام، سیاسی نظام، عدالتی نظام، پولیس، فوج، مزدور، کسان، ٹیچر، پروفیسر، انجینیر، مل، کارخانے، ریل، بس، ریلیں اور ہوائی جہاز، بندوق کی گولی، اور ایٹم بم یہ تمام کے تمام انھیں چیزوں کے حصول کے ذرائع ہیں۔ تعلیم کا تو اب مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ تعلیم اور روزگار دو ہم معنی لفظ بن گئے ہیں۔ تعلیم کا مقصد روزگار یا نوکری کا حصول اور روزگار یا نوکری کے لئے تعلیم کا حصول۔

ہمارا ملک بھارت بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں ہے۔ ہم نے بھی روٹی، کپڑا اور مکان کے حصول کو نصب العین بنایا ہے۔ اور تعلیم کا پورا نظام اسی کے گرد گھوم رہا ہے چنانچہ نئی تعلیمی پالیسی میں یہ بات زور دے کر کہی گئی ہے کہ یہ روزگار فراہم کرے گی اور بے کار افراد نہیں پیدا کرے گی موجودہ تعلیمی پالیسی کے متعلق جو سب سے بڑی تنقید کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کلرک پیدا کرتی ہے اور یہ کہ یہ انگریزوں کا قائم کیا ہوا نظام تعلیم ہے جس کو لندن میں ۱۸۳۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس نے قائم کیا تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ضرورتیں ان کے ذریعہ پوری کی جاسکیں چنانچہ آرٹس میں ڈگری حاصل کرنے والوں کی تعداد ۵۲٪ ہے جبکہ جاپان میں ۱۵٪ برطانیہ میں ۳۰٪ سوویت روس میں ۲۰٪ امریکہ میں ۱۷٪ ہے اس کے برخلاف زرعی شعبہ میں ڈگری حاصل کرنے والوں کا تناسب ہندوستان میں [illegible] ۳۲٪ سوویت میں ۱۵٪ جاپان میں ۲۵٪ اور امریکہ میں [illegible]

انجینئرنگ میں ۲۴٫۲٪، زراعت میں ۴٪ اور جانوروں کے علاج میں ۰٫۶٪ ہے۔

اس وقت پورے ہندوستان میں ۶۴٪ لوگ ان پڑھ ہیں صرف ۳۶٪ پڑھے لکھے ہیں۔ جس میں شہر اور دیہات کا تناسب ۵۰٪ اور ۳۰٪ ہے جبکہ مردوں اور عورتوں کا تناسب ۸۰٪ اور ۲۰٪ ہے۔

پورے ملک میں پڑھے لکھے بے روزگاروں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کو اگلے دہوں میں بھی نوکری فراہم نہیں کی جا سکتی۔ پچھلے سال ۳ر اگست یو این آئی کے مطابق ۲ لاکھ ۱۵ ہزار ڈاکٹر اور ۴۷ ہزار انجینئر بے کار ہیں اور ۲۱ ویں صدی تک پوری دنیا کے بے کار لوگوں کی آدھی تعداد ہندوستان میں ہوگی۔ (اوکاش ۱۵ر اگست ۱۹۸۶ء)

ہمارے ملک اور دانشوروں کی یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ آزادی کے ۳۹ سالوں تک انگریزوں کی بنائی ہوئی تعلیمی پالیسی پر ہم عمل کرتے رہے اور نوجوانوں کو کلرک اور انگریزوں کے مفاد کا حامل بناتے رہے۔ انھوں نے تاریخ کو جو رخ دیا اور ادب اور آرٹ کو جو شکل بخشی آنکھیں بند کر کے اس پر چلتے رہے نتیجہ یہ نکلا کہ آج اس کے کڑوے کسیلے پھل ہماری جھولی میں ہیں اور آج ہم اپنے ہی نوجوانوں سے اپنی ہی اولاد سے اور اپنے ہی بچوں کے شکووں سے نالاں ہیں۔ آج وہ بے کار ہیں، بے روزگار ہیں، ملک و معیشت پر بوجھ ہیں، اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اسمگلنگ کرتے ہیں، چوری کرتے ہیں، ڈاکے ڈالتے ہیں، نفرت و حقارت کے بیج بو کر دوسروں کو لڑاتے ہیں، شر و فساد پھیلاتے ہیں۔ ہم نے ان کو سب کچھ بنایا مگر ایک اچھا شہری اور اچھا انسان نہ بنا سکے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کریں، ہر ایک کے دکھ درد میں کام آئیں، فرد، قوم، معاشرہ اور ملک و ملت کی خدمت کریں اور ۳۹ سال بعد جب ہم غور کرنے پر آئے تو ہم نے ان کو معاشی حیوان بنا دیا۔ کیا اب ہمارے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے انسان اور اچھے شہری نہیں بلکہ معاشی حیوان پیدا ہوں گے۔ کیا تاریخ، سماجیات، سیاسیات ہر ایک کو اسی رخ پر موڑ دیا جائے گا؟ نئی تعلیمی پالیسی تو ہم کو یہی بتاتی ہے۔

۱۔ اس میں تعلیم کو روزگار سے جوڑ دیا گیا ہے۔

۲۔ ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کی بات کہی گئی ہے۔

۳۔ ہائی اسکول اور اس کے اوپر پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل تعلیم دی جائے گی۔

۴۔ ملکی وحدت اور سالمیت کو نظر میں رکھتے ہوئے تاریخ، سماجیات، سیاسیات اور عام سماجیات کو نیا رخ دیا جائے گا۔

اگر موجودہ تعلیمی پالیسی ایک انتہا تھی تو نئی تعلیمی پالیسی بھی ایک انتہا ہے۔ جو چیز ان دونوں میں قدر مشترک ہے وہ یہ کہ اچھا شہری اور اچھا انسان دونوں میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور اس وقت ہندوستان کو ایسے نظام تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے جو کار آمد، مفید، ہنرمند، با اخلاق اور اچھا شہری پیدا کرے۔

دولت کمانا، مکان تعلیم کا نہایت پست اور گھٹیا مقصد ہے۔ اس کا اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ انسان علم کے نتیجہ میں اپنے آپ کو پہچانے، اس کائنات کی حقیقت کو جانے اور اس کے پیچھے چھپے ہوئے اس راز کو پائے جس کو خدا کہتے ہیں اور پھر خلق خدا سے محبت کر سکے۔

نئی تعلیمی پالیسی ملک کو ترقی کی راہ پر تو لگا سکتی ہے اور صنعتی حیثیت سے ہم بہت آگے جا سکتے ہیں مگر اخلاقی حیثیت سے ہم بالکل کھوکھلے ہو جائیں گے اس پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس پالیسی کا اثر اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں پر بہت گہرا پڑے گا۔ افسوس کہ ذہنوں کو کالج کی سوچی والی بات مسلمانوں پر صد فیصد صادق آئے گی بلکہ یکساں سول کوڈ کی طرح مسلمان بچوں کو قومی دھارے میں شامل کرنے کے لئے تعلیم کے ذریعہ NATIONALIZATION (قومیانا) ہے۔ اس پر دینی تعلیمی کونسل، مسلم پرسنل لا بورڈ، علماء کرام، اکابرین ملت، و لیڈروں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

بقیہ حلقۂ یاراں

ماشاء اللہ "نیات نو" دن بدن نکھرتا جا رہا ہے لیکن ایک شکایت جو پہلے تھی سو اب بھی ہے وہ یہ کہ رسالہ کا سرورق خشک و بے رنگ لگتا ہے رہی رسالہ کے اندر کی بات تو میں بالکل تعریف نہیں کروں گا مجھے ڈر ہے کہیں آپ پھول نہ جائیں۔

جناب عالی میری غزلوں میں کتابت کی کچھ غلطیاں ہوئی ہیں جس کی تصحیح ضروری ہے۔ میری پہلی غزل کا ایک مصرعہ ہے۔ "پاس ناوید کی ہے شیوہ کافری" اور یوں شائع ہوا ہے:
"پاس نوید کی" درمیان سے "و" غائب ہے۔

دوسری غزل کے ایک مصرعہ کی تقطیع ہی اٹک گئی ہے؟ دیکھئے مصرعہ یوں ہے:
"زیست مانند یک حباب انور" شائع ہوا ہے "زیست مانند کہ حباب اے انور"

خاکسار ابو ذفان انور، کذی گاؤں، بس اسٹینڈ روڈ، پ س، کرناٹک

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہٗ

تاج الدین تاج اورنگ آبادی

مقیم ٹاکلی واجد رائے تعلقہ خلد آباد

ضلع اورنگ آباد۔ مہاراشٹرا

صف اسلام کا پہلا مسلماں
وہ ہے صدیق اکبر ماہ تاباں
وہ ہجرت میں رسول اللہ کا ہمدم
بنی معراج محمدؐ جزو ایماں
اسی نے دی مظالم سے رہائی
بلالؓ و دو کو بخشا ہے درماں
کلام اللہ کے حافظ بھی تھے
تھی ان کے قلب میں آیات قرآں
بیک وقت سب کو یکجا کرکے جس نے
مرتب کر دیا نورانی قرآں
ہوا وہ جانشیں خیر البشرؐ کا
اسے اسلام کا تھا خاص عرفاں
ہوائے ارتداد اٹھی یکایک
کہ یہ تھا امتحان صدق و ایماں

وہ تھا پروانۂ شمع نبوت
قیامت تک رہیگا اسکا فیضاں
اسی کے عزم محکم نے کیا ہے
نبوت کے دعاوی کو پریشاں
دکھائی مرتدوں کو راہ سیدھی
ہوا اسلام دوبارہ درخشاں
مٹایا فتنۂ باطل کو جس نے
یہ صدیقی عزیمت کا تھا فیضاں
عمرؓ عثمانؓ علیؓ اصحاب صفہؓ
سبھی اصحاب تھے ماہ درخشاں
قیامت تک فراست اسکی رہبر
مسلماں کے لئے ہے دین و ایماں
خلافت راشدہ ہے اک نمونہ
یہی قانون ہے آئین قرآں

حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ

تحریر:- الدکتور عبدالرحمان رافت الباشا۔ ترجمانی:- ابو جاوید

میدان اُحد میں محمد بن عبداللہ (فداہ ابی و امی) سے مقابلے کے لئے قریش بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوئے۔ اس فوج میں جہاں ان کے بڑے بڑے سردار شامل تھے وہیں انکے غلام بھی شریک تھے۔ اس وقت ان کے سینے بغض و کینہ سے بھرے ہوئے تھے۔ اور جنگ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جانے والے اپنے مقتولین کے انتقام کی آگ ان کی رگوں میں خون کے ساتھ گردش کر رہی تھی۔ اس مہم میں مردوں کے دوش بدوش قریش کے بڑے گھرانوں کی بہت سی شریف زادیاں، اور معزز خواتین بھی شریک ہو گئی تھیں تاکہ وہ مردوں کو قتال پر برانگیختہ کریں۔ بہادروں کے دلوں میں غیرت و حمیت اور عصبیت کی آگ بھڑکاتی رہیں اور اگر کہیں ان کے اندر کمزوری اور پست ہمتی دیکھیں تو ان کی ہمت بندھائیں اور انھیں میدان کارزار میں ثابت قدم رکھیں۔

فوج کے ہمراہ جانے والی ان خواتین میں ابو سفیان کی زوجہ ہند بنت عتبہ، عمرو بن عاص کی بیوی ریطہ بنت منبہ اور سُلافہ بنت سعد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سلافہ بنت سعد کے ساتھ اس کا شوہر طلحہ اور اس کے تینوں بیٹے مسافع، جلاس اور کلاب بھی تھے۔

کوہ اُحد کے پاس جب دونوں فوجیں باہم متصادم ہوئیں اور جنگ کی آگ بھڑک اٹھی تو ہند بنت عتبہ اور اس کے ساتھ کی عورتیں اٹھیں اور صفوں کے پیچھے جا کھڑی ہوئیں۔ وہ اپنے ہاتھوں میں دف لئے انھیں بجا بجا کر گا رہی تھیں ؎

اِنْ تُقْبِلُوا نُعَانِقْ - وَنَفْرِشُ النَّمَارِقْ
اَوْ تُدْبِرُوا نُفَارِقْ - فِرَاقَ غَيْرِ وَامِقْ

اگر تم دشمن سے جنگ کے لئے آگے بڑھوگے تو ہم تمہیں گلے لگائیں گی اور تمہارے لئے آرام دہ بستر بچھائیں گی۔ لیکن اگر تم نے پیٹھ پھیر لی تو ہم نفرت و حقارت کیساتھ تمہیں چھوڑ دیں گی۔

ان کا یہ ترانہ قریشی بہادروں کے سینوں میں غیرت و حمیت کے شعلہ جوالہ کو ہوا دے رہا تھا۔
اور ان کے شوہروں پر جادو کر رہا تھا۔

پھر جنگ کا ہنگامہ سرد ہوا اور اسمیں قریش کو مسلمانوں پر فتح حاصل ہوئی تو قریشی عورتیں جو نشۂ فتح و کامرانی میں چور تھیں ــــ اُحد کی طرف بڑھیں۔ وہ میدان جنگ میں زیر لب گنگناتی ہوئی مسلمان شہداء کی لاشوں کو بڑے انہماک کے ساتھ تلاش کرتی اور انھیں بُری طرح مسخ کرتی پھر رہی تھیں۔ انھوں نے ان کے پیٹ چاک کر ڈالے، آنکھیں پھوڑ دیں، کان کاٹ لئے اور ناکیں تراش دیں۔ اور ان میں سے ایک عورت کی آتش غیظ و غضب اس کے بعد بھی سرد نہ ہوئی تو اس نے، ان کے ہونٹ، اعضاء سے ہار اور پازیب بنا کر انھیں اپنے گلے اور پاؤں کی زینت بنا لیا۔ اور یہ سب کچھ اس نے اپنے باپ، بھائی اور چچا کے انتقام میں کیا جو جنگ بدر میں قتل کئے گئے تھے۔ مگر سلافہ بنت سعد کی شان اس کے ساتھ کی ان خواتین سے بالکل مختلف تھی۔ وہ نہایت اضطراب و بے چینی کی کیفیت میں مبتلا تھی اور انتہائی بے تابی کے ساتھ اپنے شوہر یا تینوں لڑکوں میں سے کسی ایک کی آمد کی منتظر تھی تاکہ اس کے ذریعہ دوسروں کی خیریت معلوم کر سکے اور پھر وہ بھی دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر جشن فتح منائے۔ لیکن اس کے انتظار کی یہ گھڑیاں طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی واپس نہ آیا۔ آخر کار وہ میدان جنگ میں گھس گئی۔ وہ مقتولین کے چہروں کو بغور دیکھتی پھر رہی تھی، اچانک اس کی نگاہ اپنے شوہر کے جسد بے روح پر پڑی جو اپنے خون میں لت پت زمین پر پڑا تھا۔ وہ کسی خوف زدہ شیرنی کی طرح بدحواس میدان میں تیزی سے ادھر ادھر دوڑنے لگی۔ وہ اپنے بیٹوں، مسافع، کلاب اور جلاس کی تلاش میں ہر سمت اپنی نظریں دوڑاتی رہی اور آخر کار، انھیں دیکھ ہی لیا۔ وہ کوہ احد کی تلی میں زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے مسافع اور کلاب تو اپنا سفر حیات ختم کر چکے تھے البتہ جلاس کو اس نے اس حال میں پایا کہ اس کی زندگی کی آخری سانسیں ابھی باقی تھیں۔ سلافہ اپنے بیٹے کے اوپر جھک گئی جو سکرات موت سے نبرد آزما تھا۔ اس نے جلاس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے منہ اور پیشانی سے خون صاف کرنے لگی۔ اس غم انگیز منظر کی ہولناکی سے آنسو اس کی آنکھوں سے خشک ہو چکے تھے۔ وہ جلاس کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہوئی بولی۔

"میرے لال! کس نے تجھے پچھاڑا ہے؟"

جلاس جواب دینا چاہتا تھا لیکن عالم نزع کی خرخراہٹ اس کے آڑے آ گئی اور وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ سلافہ نے بار بار اور اصرار کے ساتھ پوچھا تو اس نے بمشکل صرف اتنا کہا: "مجھے عاصم بن ثابت نے پچھاڑا ہے۔ اور ...... اور میرے بھائی مسافع کو بھی۔ اور ......" اور جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی اس نے آخری ہچکی لی اور اس کا جسم بے جان ہو گیا۔

سلافہ بنت سعد اس صورت حال کو دیکھ کر دیوانی ہو گئی۔ وہ بآواز بلند چیخ چیخ کر رونے لگی اور اس نے لات و عزّیٰ کی قسم کھا کر کہا۔

"جب تک قریش اس کے لئے عاصم بن ثابت سے انتقام نہ لے لیں اور اس کو شراب پینے کے لئے عاصم کی کھوپڑی نہ دے دیں، نہ اس کی بے قراری کو قرار نصیب ہوگا، نہ اس کی آنکھوں کے آنسو خشک ہوں گے۔ پھر اس نے نذر مانی کہ

"جو شخص عاصم بن ثابت کو زندہ گرفتار کر کے لائے گا یا قتل کر کے اس کا سر پیش کرے گا وہ اسے مالا مال کر دے گی۔"

اس کی یہ نذر قریش میں مشہور ہو گئی اور مکہ کے ہر جیالے اور قسمت آزما نوجوان کے دل میں یہ آرزو کروٹیں لینے لگی کہ کاش وہ عاصم بن ثابت کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا یا اس کا سر سلافہ کے سامنے پیش کر کے اس کے اعلان کردہ انعام کا مستحق قرار پاتا۔

جنگ اُحد کے خاتمہ کے بعد مسلمان مدینہ واپس لوٹ آئے۔ وہ جنگ اور اس میں پیش آنے والے واقعات کا آپس میں ذکر کرتے۔ ان بہادروں کے لئے اظہار ہمدردی و غم گساری کرتے جو جنگ میں جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ اور ان لوگوں کے حق میں تعریفی کلمات کہتے جنھوں نے غیر معمولی جرات و شجاعت کا مظاہرہ کیا اور شمشیر زنی کے جوہر دکھائے۔ وہ خاص طور سے حضرت عاصم ابن ثابت رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کرتے اور اس بات پر اظہار حیرت کرتے کہ "انکے لئے کس طرح یہ ممکن ہوا کہ انھوں نے ایک ہی گھر کے تین حقیقی بھائیوں کو خاک و خون میں لٹا دیا اور ان کے علاوہ بھی کئی ایک کو موت کے گھاٹ اتارا۔"

یہ سن کر انھیں میں سے کسی نے کہا۔

اس میں حیرت کی کون سی بات ہے، کیا آپ لوگوں کو یہ بات یاد نہیں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر سے کچھ پہلے ہم لوگوں سے دریافت فرمایا تھا کہ "تم لوگ قتال کس طرح کرو گے؟" تو اس وقت عاصم بن ثابت نے کمان ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تھا:

"جب دشمن ہم سے سو ہاتھ کے فاصلے پر ہوگا تو ہم تیر اندازی سے کام لیں گے اور جب وہ قریب آجائیں گے اور ہمارے نیزوں کی پہنچ کے دائرے میں ہوں گے تو نیزہ بازی ہوگی حتی کہ نیزے ٹوٹ جائیں گے، اور جب نیزے ٹوٹ جائیں گے تو ہم انھیں پھینک کر اپنی تلواریں بے نیام کر لیں گے اور پھر شمشیر زنی کے ہاتھ دکھائیں گے۔" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا،

"هٰكَذَا الْحَرْبُ ...... مَنْ قَاتَلَ فَلْيُقَاتِلْ كَمَا يُقَاتِلُ عَاصِمُ بْنُ ثَابِتٍ۔"

"یہ ہے جنگ کا صحیح طریقہ، جسکو قتال کرنا ہو وہ عاصم بن ثابت کیطرح قتال کرے۔"

جنگ احد کے کچھ دنوں بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص مہم پر بھیجنے کے لئے چھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو طلب فرمایا اور حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر مقرر کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں پاک نفس انسانوں کی یہ مختصر سی جماعت روانہ ہوگئی۔ وہ اپنے اس سفر کے دوران مکہ کے قریب ایک راستہ سے گزر رہے تھے کہ قبیلہ بنو ہذیل کے کچھ لوگوں کو ان کی خبر ہوگئی۔ خبر ملتے ہی وہ تیزی کے ساتھ ان کی طرف دوڑ پڑے اور انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہ دیکھ کر حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی تلواریں سونت لیں اور محاصرین سے لڑنے کے لئے تیار ہوگئے۔ بنو ہذیل نے کہا کہ "تم لوگ ہم سے مقابلہ نہیں کر سکو گے اور نہ ہم سے لڑ کر اپنی جانیں ہی بچا سکو گے۔ تمھارے حق میں بہتر یہی ہے کہ تم اپنے ہتھیار رکھ دو۔ واللہ ہم تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے، ہم اپنے اس عہد پر خدا کو گواہ بناتے ہیں۔"

اصحاب رسول نے یہ سن کر ایک دوسرے کی طرف مشورہ طلب نظروں سے دیکھا تب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"خدا کی قسم میں تو کسی مشرک کے عہد و پیمان پر اعتماد کر کے خود کو اس کے حوالے نہیں کر سکتا" پھر انھوں نے دل ہی دل میں سلافہ بنت سعد کی نذر کو یاد کیا اور یہ کہتے ہوئے تلوار

کھینچ لی۔

اللھم انی احمی لدینک وادافع عنه فاحم لحمی وعظمی ولا تظفر بهما احدا من اعداء الله ......"

"خدایا! میں تیرے دین کی حمایت میں کھڑا ہوں اور اسکی طرف سے مدافعت کر رہا ہوں۔ خدایا! میرے گوشت اور میری ہڈی کو دشمنان خدا سے محفوظ رکھنا اور ان پر کسی کو قابو نہ دینا۔"

پھر وہ بنو ہذیل پر ٹوٹ پڑے۔ اس حملے میں ان کے دو ساتھیوں نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ لوگ دشمن سے برابر لڑتے رہے اور ایک ایک کر کے تینوں شہید ہوگئے۔ ان کے باقی ساتھیوں نے اپنے آپ کو دشمنوں کے حوالے کر دیا لیکن انھوں نے اپنے عہد و پیمان کو پورا نہ کیا اور ان کے ساتھ بدترین قسم کی غداری اور بدعہدی کے ساتھ پیش آئے۔

ہذیل والوں کو پہلے یہ بات معلوم نہ تھی کہ ان کے ہاتھوں قتل ہونے والوں میں سے ایک عاصم بن ثابت بھی ہیں۔ بعد میں جب ان کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ اس کے بدلے وہ ایک بڑا انعام حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ سلافہ بنت سعد نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر وہ عاصم بن ثابت پر قابو پا جائے گی تو اس کے کاسۂ سر میں شراب پیئے گی اور اس نے عاصم کو زندہ یا مردہ کسی حالت میں اپنے سامنے پیش کرنے والے کو منہ مانگا انعام دینے کا اعلان کیا تھا۔

حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کی شہادت کے چند گھنٹوں کے اندر اندر قریش کو اسکی اطلاع ہوگئی، کیونکہ ہذیل کا قبیلہ مکہ کے قریب ہی آباد تھا۔ یہ خبر ملتے ہی سرداران قریش نے قاتلین عاصم کے پاس ان کا سر لانے کے لئے ایک قاصد بھیجا تاکہ سلافہ بنت سعد کی آتش انتقام کو فرو کر سکیں، اس کی نذر پوری کر سکیں اور اس کے تینوں بیٹوں کا غم کچھ ہلکا کر سکیں جن کو حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا تھا۔ انھوں نے چلتے ہوئے قاصد کو ایک بڑی رقم دیتے ہوئے اسے اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ بے دریغ مال خرچ کر کے ہر قیمت پر بنو ہذیل سے عاصم بن ثابت کا سر حاصل کرے۔

بنو ہذیل جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کا سر ان کے جسم سے جدا کرنے کے لئے ان کی لاش

کے پاس پہنچے تو ہوا یک وہ شہد کی مکھیوں اور بھڑوں کے ایک جھنڈ کا سامنا کر رہے تھے جو ہر طرف سے اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھیں۔ یہ لوگ جب بھی لاش کے قریب آنے کی کوشش کرتے وہ مکھیاں اور بھڑیں اڑ کر ان کے چہروں، آنکھوں اور جسم کے مختلف حصوں پر ڈنک مارتیں اور انھیں وہاں سے دور بھاگ جانے پر مجبور کر دیتیں۔ کئی بار کی پیہم کوشش کے باوجود جب وہ لوگ اس لاش کے قریب پہنچنے سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے آپس میں کہا کہ فی الحال اسے یونہی چھوڑ دو اور رات کا اندھیرا پھیل جانے دو۔ رات کی تاریکی میں یہ بھڑیں خود ہی اس کو چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ اور اس وقت ہم آسانی اپنا مقصد حاصل کر لیں گے۔ چنانچہ وہ کچھ فاصلے پر بیٹھ کر آمد شب کا انتظار کرنے لگے۔

دن ابھی ختم نہیں ہوا تھا اور رات کی آمد میں ابھی دیر تھی کہ دیکھتے دیکھتے آسمان پر گھنگھور گھٹاؤں کی دبیز چادر تن گئی، فضا گہری تاریکی میں ڈوب گئی اور ماحول بجلی کی زور دار اور پیہم گرج سے لرزنے لگا۔ اور پھر موسلا دھار بارش کا سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہو گیا جیسے آسمان کے بند ٹوٹ گئے ہوں۔ نالوں میں پانی تیزی کے ساتھ بہنے لگا، وادیاں اور گھاٹیاں سب جل تھل ہو گئیں اور پانی کا ریلا سیل عرم کی طرح زمین پر پڑی ہوئی ہر چیز کو اپنے ساتھ بہائے لے چلا گیا۔

صبح کو بنو ہذیل حضرت عاصم رضی اللہ کی لاش کو ہر طرف ڈھونڈتے پھر رہے تھے مگر انھیں اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ سیلاب کی موجیں اسے دور بہت دور نہ جانے کہاں بہا کر لے گئیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کی دعا کو شرف قبولیت سے نوازا اور ان کے جسد اطہر کو مسخ ہونے سے بچایا اور ان کے سر مبارک کو اس بات سے محفوظ رکھا کہ ان کی کھوپڑی میں شراب پی جائے۔ اور اس نے مشرکوں کی ان پر غالب آنے کی تمام راہیں مسدود کر دیا۔

(بقیہ فرقہ لسانی)

آخری الفاظ یہ تھے کہ مسعر کو کیمپ ڈیوڈ معاہدے سے فی الفور جان چھڑا لینی چاہیے۔" اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کا ٹھکانا بنائے۔ وہ مجاہد تھے اور جہاد کرتے کرتے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ گو وہ دنیا سے خود رخصت ہو گئے ہیں، مگر ان کی تحریک باقی ہے۔ بلکہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ مستحکم اور مضبوط ہے۔ مصر جو اسکے بہتے ہوئے مصر کا مستقبل اسلام کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ دن قریب ہے جب مصر اسلامی شریعت کی برکتوں سے بہرہ ور ہوگا۔

(تکبیر)

بدر عالم خان ایم۔ اے (علیگ)

غزل

کتنا بے چین ہے خاموش سمندر دیکھو
دل کی گہرائی میں اک روز اتر کر دیکھو

قتل ہو جائیگا سورج تو لہو ہوگی سحر
دیکھنا ہے تو ابھی صبح کا منظر دیکھو

راز در راز ہے الفاظ کی گہرائی میں
مرے چہرے پہ جو تحریر ہے پڑھ کر دیکھو

خامشی گونج بھی ہے چیخ بھی ہے نغمہ بھی
تم کسی پیڑ کو نزدیک سے چھو کر دیکھو

کیسے پتھر کا جگر چیر ابھرتی ہے حیات
کسی چٹان تلے بیج دبا کر دیکھو

یوں تو چہرے پہ سجا رکھی ہے اک بزم نشاط
کتنے مقتل ہیں مرے سینے کے اندر دیکھو

آذر و مانی و بہزاد رگوں میں ہیں رواں
برف کی سل پہ کبھی خون بہا کر دیکھو

عشوہ و غمزہ و ابرو کی حقیقت کیا ہے
مل گئے خاک میں چنگیز و سکندر دیکھو

عشق زردار و غنی، مفلس و نادار خرد
اپنا کشکول لیے پھرتی ہے در در دیکھو

دیکھ لینا پس قاتل بھی کوئی ہوگا ضرور
صرف قاتل ہی چلاتا نہیں خنجر دیکھو

حبس دم ہے کہ دم ساز ہے صدیوں کی گھٹن
کھڑکیاں کھول دو، کچھ دیر تو باہر دیکھو

تیز رو کوہ گراں، ٹھہری ہوئی موج رواں
غرب سے اگتا ہوا خسرو خاور دیکھو

سخت ریشم کی طرح، نرم ہے پتھر کی طرح
زندگی کا یہ بدلتا ہوا پیکر دیکھو

ڈاکٹر جمال آرا نظامی

مولانا حالی کی کتاب

مقدمۂ شعر و شاعری

"مقدمۂ شعر و شاعری" فن پر اردو کی پہلی مستقل کتاب ہے جو حالی کے وسیع مطالعے اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اس موضوع پر وہ برسوں مختلف مکاتبِ مشرق کی تصانیف کا مطالعہ کرتے رہے۔ انگریزی سے ناواقفیت کے باوجود انھوں نے مغربی افکار کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ متعدد مضامین پڑھوا کر سنے۔ قیام لاہور کے زمانے میں مغربی ادب کی جو معمولی آگاہی حاصل ہوئی تھی اس سے فائدہ اٹھایا۔ سرسید کے خیالات و افکار سے خوشہ چینی کی اور اسے مقدمۂ شعر و شاعری کی شکل میں پیش کر دیا۔ مقابلہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید نے مختلف مضامین میں جن افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے مولانا حالی نے ان سب کو اس مقدمہ میں سمو لیا ہے لیکن اپنے خیالات کو انھوں نے انگریزی فارسی اور عربی ادب کے حوالوں سے مستحکم کیا ہے۔ یہ اردو تنقید نگاری میں پہلی باضابطہ کوشش اور بنیادی کتاب کہی جا سکتی ہے۔ اس سے پہلے اردو کا تنقیدی سرمایہ بیشتر شعرا کی سوانح اور تذکروں پر مشتمل تھا۔ حالی نے پہلی مرتبہ اردو شاعری کے پورے سرمایہ کا تنقیدی جائزہ لیا اور اپنے خیالات کو مدلل اور مفصل طور پر مقدمہ میں پیش کر دیا۔

حالی عربی فارسی کے علاوہ ترجموں کے ذریعہ انگریزی تنقیدی ادب سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ اس دور میں انگریزی تہذیب کا رواج تھا۔ انگریزی معاشرت اور تہذیب کو اپنانا فخر کی بات سمجھا جاتا تھا۔ انگریزوں کی پیروی میں اپنی ترقی کا راز مضمر سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر چیز میں انگریزی کی پیروی لازم تھی۔ سرسید جیسی ہمہ گیر شخصیت نے مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ پیش کیا جس کی بہ خصوص سیاسی، تعلیمی، معاشرتی، مذہب اور ادب میں ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی، جو علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کی جانے لگی۔ سرسید ایک دور اندیش مصلح اور باشعور انسان تھے ان کو حالات کی تبدیلی کا خوب احساس تھا انھوں نے مغلیہ سلطنت کی عظیم الشان حکومت کو برباد ہوتے دیکھی تھی مسلمانوں کی بدحالی پر ان کی نظر تھی اور ساتھ ہی انگریزی اقتدار کے بڑھتے ہوئے استحکام کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ۱۸۶۹ء میں انھوں نے لندن کا سفر کیا اور وہاں کے [redacted] کی اصلاح اور [illegible] میں جو

زندگی کا شعور عام کرنے کے لیے اور نئے حالات سے مفاہمت کرنے کے خیال سے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ سرسید کی نگاہ مغربی تہذیب و تمدن کی برکتوں پر گہری تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کی فکر و نظر کو روشن کرنے کے لئے جہاں مغربی تعلیم کے نور سے فیضیاب ہونے پر زور دیا وہیں انھوں نے شعر و ادب کا بھی ایک جدید نظریہ پیش کیا۔ تہذیبی دور میں نہ صرف تمدن کی قدریں ظاہری آسائش، زینت اور تکلف کے ہو گئے تھیں بلکہ ادب بھی اپنا جوہر کھو بیٹھا تھا۔ چند شعرا کو چھوڑ کر ہماری شاعری لفاظی، چھوٹے اور دور از کار خیالات، تصنع اور سستی جذباتیت کا ایک دفتر پریشان رہ گئی تھی۔ سرسید نے اس کے سرمایہ پر نظر ڈالی تو انھیں نظم جسے وہ شاعری کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں نہ صرف ناقص بلکہ غیر مفید بھی نظر آئی۔ چنانچہ لاہور میں انجمن پنجاب کے موضوعاتی و نیچرل مشاعروں کا انھوں نے خیر مقدم کیا۔ حالی بھی اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے جب قوم کی پستی کا جائزہ لیا تو اس میں دوسرے اسباب کے ساتھ یہ ضروری سمجھا کہ انگریزی ادب کی طرح ہمارے ادب کو بھی زندگی اور اس کی ضروریات سے ہم آہنگ ہونا چاہئے جو ادب زندگی کا آئینہ دار اور حقیقت کا ترجمان نہ ہو وہ قومی زندگی کے لئے نقصان دہ اور ہلاکت ہے۔ حالی نے مشرقی اور مغربی مفکرین کے اقوال کی روشنی میں پوری اردو شاعری خصوصاً غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ کا جائزہ لیا اس کی خامیوں پر روشنی ڈالی اور ایسی تجویزیں پیش کیں جن سے ادب محض تفریح کا ذریعہ نہ رہ کر حقیقی زندگی کا آئینہ دار ہو سکے۔ مقدمۂ شعر و شاعری کے متعلق موضوعات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ نظریاتی اور عملی۔ نظریاتی حصے میں شعر کی تعریف، اس کی تاثیر، عظمت اور محاسن بیان ہوئے ہیں۔ اور شعر کے بارے میں مشرق و مغرب کے خیالات، بحیثیت مجموعی شاعری کی ضرورت، سوسائٹی سے شاعری کا تعلق، شاعری کے لوازم اور مختلف زبانوں میں شاعری کی تعریف سے بحث کی گئی ہے۔

عملی حصے کا موضوع صرف اردو شاعری ہے۔ اردو شاعری کے چار مشہور ترین اصناف غزل اور مرثیہ، مثنوی اور قصیدہ پر تنقید کی گئی ہے۔ اس دور میں اصناف سخن کی جو حالت تھی اور ان میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، اس سے بحث کی گئی ہے اور ضروری اصلاح کے مشورے دیے ہیں۔

نظم میں حالی کا سب سے بڑا کارنامہ مسدس مد و جزر اسلام ہے جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے۔ حالی کی شاعری کے دو دور کیے جا سکتے ہیں ایک قدیم اور دوسرا جدید۔ شیفتہ سے ملاقات سے پہلے حالی روایتی انداز کی شاعری کرتے تھے لیکن ان سے ملاقات کے بعد رفتہ رفتہ روش عام سے دور ہونے لگے۔ لاہور پہنچ کر

جو ان کے نظریات میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ مغربی ادب سے بالواسطہ واقف ہو گئے اور نیچرل شاعری پر زور دینے لگے، پھر سرسید کے زیر اثر انھوں نے شاعری سے تعلیم اخلاق تبلیغ و اصلاح کا کام لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی نے اصل غزلیں صرف پہلے دور شاعری میں کہیں، دوسرے دور شاعری میں تو نظم کی کیفیت ہی رہی یا پھر نثر کی کارناموں کی طرف توجہ دی۔ اس طرح غزلیں صرف گنتی کی ہوئیں مگر حقیقت یہ ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ جب دل و دماغ میں کوئی کیفیت بس جائے تو وہ تحت الشعور میں تو دب سکتی ہے لیکن بالکل ختم نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں نظموں میں بھی وہ مختلف انداز کا حسن تغزل پایا جاتا ہے، وہ اس میں بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ان کے یہاں بیشتر غزل کا حسن ملتا ہے۔ اور یہ ان کے دل کی رام کہانی کے دور کی شاعری کا کرشمہ ہے تو ان متانت اور اعتدال تو شروع ہی سے ان کی شاعری کے عناصر تھے، تفکر، تعقل اور تحقیق زمانے کے ساتھ ساتھ اجزائے خاص کے طور پر داخل ہوتے چلے گئے۔ حالی نے اپنی غزلوں میں میر کا درد، غالب کا انداز بیان اور شیفتہ کی سادگی، صداقت سب کو یکجا کر دیا۔ نیاز فتحپوری کے الفاظ میں: غالب کے شاگردوں میں خواجہ حالی صحیح رنگ تغزل کے لحاظ سے اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ سوز و گداز، شیرینی، سلاست، اعتدال و راز حقیقت نگاری جو غزل کی جان ہیں ان کے یہاں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ (ماخوذ)

بقیہ اداریہ

قاتلوں پر پابندی نہیں لگائی گئی، وہ اس کے ذمہ داروں کو اختیار میں نہیں لیا گیا۔

پولس کو ناکافی انتظام کیا گیا۔

پولس دیا دل چھوڑ کر اپنی قوم کے جذبات میں شریک ہو گئی اور عملاً کر خود دوسرے فرقے کے لئے ہو گیا

بلکہ پولس باہر میلہ پر شریک رہی۔

چیف منسٹر حالات اور واقعات سے چشم پوشی کرتے رہے۔

مرکزی حکومت نے وقت پر توجہ نہیں دی۔

ان پر مجھے تکلیف ہوتی ہے مگر معلوم نہیں کیوں اس فساد کو کچھ زیادہ ہی ہوئی ہے۔ میں انسانیت دوست انسانوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ فساد زدہ لوگوں کی مدد کریں اور گے چیف منسٹر سے یہ جاننے کی خواہش کریں کہ کیا آپ بھی احمد آبادی کا انتخاب کریں گے۔ اگر ایسا کریں تو فسادیا جلانے اور پولس کی گولیوں سے مروانے کے بجائے کوئی اور سا شائستہ طریقہ ایجاد کریں۔

[illegible]
۱۹۹۶/۹/۲۵

اخوان المسلمون کے تیسرے مرشد عام

مولانا خلیل احمد حامدی

استاذ عمر التلمسانی: ایک فرد ایک تحریک

۲۲ مئی ۱۹۸۶ء کو قاہرہ میں استاذ عمر تلمسانی مرشد عام اخوان المسلمون دار فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم کی عمر ۸۳ سال کے قریب تھی۔ ۲۳ مئی کو نماز جمعہ کے بعد مرحوم کی نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ ہمارے خصوصی ذرائع کے مطابق استاذ عمر تلمسانی کی وفات پر پورے قاہرہ کے اندر غم و الم کی لہر دوڑ گئی۔ ہر دل عزیز شخص و انسان اشکبار ہو گیا۔ کسی حق پرست اور مجاہد شخصیت کا اٹھ جانا انسانیت کا معمولی نقصان نہیں ہے۔ موت العالم موت العالم ایک عالم کی موت در اصل ایک عالم کی موت ہے۔ جب حضرت سعد بن معاذ کا انتقال ہوا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سعد بن معاذ کی موت پر اللہ کا عرش کانپ گیا ہے۔

استاذ عمر تلمسانی ۴ نومبر ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوئے وہ اخوان المسلمون کے بانی حسن البنا سے صرف دو سال بڑے تھے۔ ان کا آبائی تعلق الجزائر کے مشہور شہر تلمسان سے تھا۔ فرانس کے قبضے کے بعد ان کے آباؤ اجداد ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ مصر ہجرت کر آئے۔ مرحوم خود مصر میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانہ نہایت خوشحال اور امیرانہ ٹھاٹ باٹ کا حامل تھا۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے آرٹس میں بی اے کیا۔ اسی سال ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اپنے رجحان طبع کے لحاظ سے قانون دانی اور وکالت کے پیشے کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے قاہرہ کے لاء کالج میں داخلہ لیا اور قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی۔ قانون کی تعلیم میں عالم عرب کے نامور قانون داں ڈاکٹر عبدالرزاق السنہوری کی شاگردی کی انھیں سعادت حاصل ہے۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی انھوں نے پریکٹس شروع کر دی اور جب تک اس پیشے سے وابستہ رہے کسی ناجائز مقدمے کو ہاتھ میں نہیں لیا۔ حق گوئی اور انصاف پسندی کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ ان کے پیش نظر اس پیشے کے ذریعے دولت کمانے کے بجائے مظلوم کی دادرسی اور قانون کی بالادستی تھی۔

یہ وہ دور تھا جب مصر میں اخوان المسلمون کی دعوت اپنے بانی کی موہوب اور پُرکشش شخصیت کی وجہ سے بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں جب اخوان کی تنظیم قائم ہوئی تھی تو اس کے اولین ارکان چھ اصحاب تھے۔ ایک دور ایسا بھی [illegible]۔ مگر جب امام حسن البنا

نے دس سال بعد ۱۹۲۸ء میں اخوان کی پانچویں سالانہ کانفرنس منعقد کی تو اس میں ہزاروں کی تعداد میں ارکان نے شرکت کی اور متفقین اور حامیوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ اسی دور میں ۱۹۳۳ء میں استاذ عمر تلمسانی امام حسن البناؒ کی دعوت سے متاثر ہوئے۔ اور ان کی بیعت قبول کر لی۔ مرحوم امام حسن البناؒ کے بارے میں اپنے خیالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۱ء تک شیخ تلمسانی جیل میں رہے۔ اس دور کے ابتدائی دس برسوں میں وہ تازیانے کھاتے اور پتھر کاٹتے رہے

"امام حسن البناؒ کے اعمال و اقوال کسی [illegible] تھے وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ اپنے علم کی رو سے دعوت حق کے کام کے لئے منتخب فرما لیتا ہے اور پھر اپنی خاص مدد سے ان کو نوازتا ہے۔ امام البنا جب گفتگو شروع کرتے تھے تو ان کے روشن چہرے پر ہماری آنکھیں گڑ جاتی تھیں۔ دل ان کی حکمت آمیز اور گوہر آمیز باتوں میں محو ہو جاتے۔ ہماری خواہش ہوتی کہ وہ پہروں یہ گفتگو جاری رکھیں۔ انھوں نے جینا نئے سرے سے سکھایا۔"

کچھ عرصہ مرحوم نے وکالت کا پیشہ جاری رکھا اور پھر اسے ترک کر کے ہمہ تن تحریک کے لئے وقف ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں جب اسرائیل کا منحوس وجود فلسطین میں قائم کیا گیا تو اخوان المسلمون نے یہ دیکھ کر عرب ممالک ہاتھ باندھے بیٹھے ہیں، اسرائیل کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ مصر اور عرب ممالک سے اخوان مجاہدین کے دستے فلسطین پہنچنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ ان مجاہدین نے یہودیوں کے چھکے چھڑا کر رکھ دئے۔ اور اگر کچھ عرصہ مزید ان کو جہاد جاری رکھنے کا موقع مل جاتا تو اسرائیل کا وجود تختۂ زمین سے محو ہو چکا ہوتا۔ استاذ عمر تلمسانی بھی اس جہاد میں شامل تھے۔ اور جب عبد الہادی پاشا کی حکومت نے اخوان کو خلاف قانون قرار دیا اور مجاہدین کو مورچوں سے بلا کر جیلوں میں ڈال دیا تو استاذ عمر تلمسانی بھی جیل میں ڈال دیے گئے اور ۱۹۵۱ء تک جیل میں رہے۔ اس دور میں جیل میں عبد الہادی پاشا کی حکومت نے ان لوگوں پر جو مظالم توڑے ان کی تفصیلات "معتقل ھاکتیب" نامی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہیں جو ایک غیر اخوانی شخص محمد علی الطاہر ایڈیٹر الشوریٰ نے لکھی ہے۔ وہ خود بھی ان دنوں جیل میں تھا۔

۱۹۵۲ء میں جب مصر میں فوج نے بادشاہت کا تختہ الٹ دیا اور اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا تو اس وقت عمر تلمسانی صاحب اخوان کے صف اول کے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اخوان المسلمون نے فوجی انقلاب کی نہ صرف حمایت کی تھی بلکہ اسے کامیاب بنانے میں پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ ان کے پیش نظر مصر کو انگریزی استعمار اور اس کی آلۂ کار بادشاہت سے نجات دلانا تھا۔ اگر انقلابیوں کو اخوان کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو وہ ہرگز انقلاب برپا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ انقلاب کے دو سال بعد اخوان المسلمون کے مرشد عام مرحوم استاذ حسن الہضیبی نے فوجی قیادت سے یہ مطالبہ کر دیا کہ فوج بیرکوں میں چلی جائے اور اقتدار سول حکومت کے سپرد کر دیا جائے۔ اس وقت کے فوجی صدر جنرل نجیب بھی بڑی حد تک اس رائے کے حامل تھے۔ مگر فوجیوں کے ایک گروہ نے جس کی قیادت جمال عبد الناصر اور عبد الحکیم کر رہے تھے واپس بیرکوں میں جانے سے انکار کر دیا۔ اس وقت عوام کے اندر اخوان المسلمون کے اثرات وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے تھے۔ انگریزی استعمار اور یہودی دونوں اس طاقت سے خائف تھے۔ علی الخصوص ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام پر اخوان المسلمون نے اسرائیل کے خلاف اپنے رضاکار دستوں کے ذریعے جو جہاد کیا تھا اس نے یہودیوں کو سراسیمہ کر دیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ شاہ فاروق کی حکومت نے حسن البناؒ کو ۱۹۴۹ء میں عین اس وقت قاہرہ میں دن دہاڑے قتل کروا دیا جب پوری اخوانی طاقت یہودیوں کے خلاف برسر پیکار تھی۔ اب اخوان کا فوجی انقلاب کو کامیاب کرنا اور پھر ملک کے اندر سول حکومت کے قیام اور اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کرنا نہ صرف اسرائیل بلکہ پوری مغربی دنیا کے لئے پریشان کن تھا۔ چنانچہ امریکہ، انگریزوں اور یہودیوں کی سازش کے تحت جنرل نجیب کو اقتدار سے الگ کر دیا گیا اور جمال عبد الناصر (جو اس وقت کرنل کے عہدہ پر تھا) کو برسر اقتدار لایا گیا۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اخوان المسلمون کو خلاف قانون قرار دیا، اور پھر فوجی طاقت اور بیرونی مدد سے اخوان کو بزعم خویش کچل دیا گیا۔ نمایاں قائدین کو تختۂ دار پر لٹکا دیا اور ہزاروں کارکنوں کو مصر کی جیلوں میں بھر دیا۔ یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔

استاذ عمر تلمسانی بھی ان لوگوں میں شامل تھے جو ۱۹۵۴ء میں گرفتار کئے گئے۔ مرحوم دوسرے کارکنوں کے ہمراہ ۱۹۷۱ء تک جیل میں رہے۔ کبھی فوجی جیل، کبھی لیمان طرہ جیل اور کبھی صحرائے مصر کا [illegible]۔ قید کے ابتدائی دس سال وہ تازیانے کھاتے اور پتھر کاٹتے رہے۔ انھیں بارہا جیل میں معافی مانگنے پر اکسایا گیا تاکہ نہ صرف وہ اس جان لیوا اسیری سے نجات حاصل کر لیں، بلکہ کسی قابل لحاظ منصب پر بھی براجمان

ہو جائیں۔ لیکن انھوں نے اپنے ایمان و عقیدہ اور تحریکی اصولوں کی خاطر ہر ایسی پیشکش کو مسکرا کر ٹھکرا دیا۔
درحقیقت اخوان المسلمون کی تحریک نے جدید مصر میں اپنے حسنِ عظیم کردار کا ثبوت دیا ہے۔ اس نے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کر دی ہے۔ جیلوں میں ان لوگوں کو مسلسل ۲۰ سال ظلموں سے کام لے رہی ہے۔ سادات کے دور میں اس کے کچھ ثمرات نکلے تھے۔ پھر حکومت نے اسے بند کر دیا۔ حسنی مبارک کی حکومت نے بھی وعدوں کے باوجود اسے واگزار نہیں کیا۔

استاد عمر تلمسانی نہ صرف جدید قانون پر بڑی دسترس رکھتے تھے بلکہ اسلامی علوم پر بھی انھیں بڑی بصیرت حاصل تھی۔ عربی کی مشہور تفسیر "کشاف" نیز "تفسیر قرطبی"، "تفسیر ابن کثیر" کا وہ مطالعہ کر چکے تھے۔ حدیث میں بخاری و مسلم، تراجم میں اسد الغابۃ اور ابن سعد کی طبقات کبریٰ، ادب و تاریخ میں ابن عبد ربہ کی العقد الفرید، اصفہانی کی الامالی اور شریف رضی کی نہج البلاغہ اور سیرت میں ابن ہشام اور اسی طرح کی دیگر امہات کتب ان کے زیر مطالعہ رہیں۔ تحریک اسلامی کی قیادت کے لئے علوم جدیدہ اور علوم اسلامیہ سے آگاہی بڑی ضروری ہے۔ مرحوم بہت اچھے ادیب تھے۔ اخوان المسلمون کی تاریخ، دعوت اور طریق تربیت پر ان کی متعدد تحریریں اور مقالات موجود ہیں۔ "شہید المحراب" کے نام سے انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت و شخصیت کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

وہ ایک بے باک اور جری انسان تھے۔ ۷۰ سال تک جن اصولوں کی خاطر ڈٹے رہنا بجائے خود ان کے عظیم حوصلے کا بین ثبوت ہے۔ ان کی جرأت و شجاعت کا دوسرا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب انور السادات نے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کیا اور اس کی رو سے اسرائیل کو تسلیم کر لیا اور اس سے سفارتی تعلقات استوار کر لئے تو اس شرمناک معاہدے پر مصر کے تمام دینی اور سیاسی حلقے گھگھیاں بندھ کر رہ گئے بلکہ بعض اہل دین کی جانب سے اس معاہدے کے فضائل گنوائے گئے اور اس کا شرعی ثبوت فراہم کیا گیا۔ مصر کے اندر اخوان المسلمون کے مرشد عام استاد عمر تلمسانی وہ واحد شخصیت تھے جنھوں نے کھل کر اس کے خلاف بیان دیا اور مصری مسلمانوں کی طرف سے اس معاہدے سے برأت کا اعلان کیا۔ غالب نے کہا:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

بڑے عفیف اللسان شخص تھے۔ کسی انسان کے بارے میں انھوں نے اپنی زبان سے کوئی نازیبا لفظ نہیں نکالا۔ اپنے مخالفین پر بھی وہ تنقید کرتے وقت نہایت مہذب زبان استعمال کرتے تھے۔ کسی نے ان کو بتایا کہ جمال سالم نے اب درویشی لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ جمال سالم ۱۹۵۴ء میں فوجی عدالت کا سربراہ تھا۔ اس نے ۶ اخوانی رہنماؤں کو موت کی سزائیں دیں اور ہزاروں مسلمانوں کو عقوبت خانوں کے حوالے کیا اور عدالت کو بالکل ایک ڈھونگ بنا کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ قوم سے فرار حاصل کر کے "درویشانہ زندگی" اختیار کر چکا ہے۔ استاد تلمسانی نے یہ سن کر فرمایا اللہ تعالیٰ کے معاملات میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔ وہ جسے بخشنا چاہے گا، بخش دے گا۔

اخوان المسلمین کے چار اولین ارکان میں سے ایک صاحب ڈرائیور دوسرے حجام، تیسرے بڑھئی اور چوتھے درزی تھے۔

سیاست میں بھی وسیع الظرف تھے۔ ۱۹۸۴ء کے ملکی انتخابات میں انھوں نے اپنی قدیم حریف پارٹی حزب الوفد سے سیاسی اتحاد کر لیا۔ اس اتحاد پر نہ صرف مصر کے سیاسی اور دینی حلقوں نے حیرت کا اظہار کیا بلکہ پورے عرب ممالک میں اس پر زبردست تنقید کی گئی۔ اس اتحاد کو ختم کرنے میں مصری اخبارات اور مصری سیاست والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر استاد عمر تلمسانی کی کشادہ دلی، دور اندیشی اور فہم و فراست نے اس اتحاد میں کوئی رخنہ نہیں پڑنے دیا۔ ۱۹۸۵ء میں جب ہم قاہرہ میں منعقد ہونے والی سیرت کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تو اس موقع پر استاد عمر تلمسانی سے بھی ملنے گئے۔ اسی ملاقات کے دوران مصر کے مشہور اخبار "الاہرام" کا نمائندہ ان سے انٹرویو لینے آگیا۔ اس کا سارا زور اس بات پر تھا کہ اخوان اور وفد میں اتحاد کیسے قائم رہ سکتا ہے نیز جب اخوان اپنی الگ حزب تشکیل دے لیں گے تو کیا پھر بھی وفد سے تحالف قائم رہے گا۔ اس حال کا پس منظر یہ تھا کہ اخوان کے نمائندوں نے مصری پارلیمنٹ میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ اٹھا رکھا تھا اور وفد پارٹی کے بعض نمائندے اس مطالبے کی حمایت سے گریز کر رہے تھے۔ اس لئے اس امر کا خدشہ تھا کہ اخوان اور وفد کا یہ اتحاد ٹوٹ جائے گا۔ مگر استاد تلمسانی صاحب نے الاہرام کے

نمائندے کو جواب دیا کہ ہمارے اور وفد کے درمیان اختلاف سے زیادہ اتحاد کی بنیادیں موجود ہیں۔ اس جماعتِ اتحاد کے ٹوٹنے کے کوئی امکانات نہیں ہیں۔ اگر ہم نے الگ راہ بنائی تو پھر بھی ہم وفد کے دوست ہی رہیں گے۔ مرحوم نے اتحاد کو قائم رکھنے کی خاطر وفد کے سربراہ سراج الدین سے ذاتی سطح تک تعلقات استوار کر لئے۔ دینی رواداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شیخ متولی شعراوی جو ہمیشہ اخوان کی مخالفت کرتے رہے ہیں، حکومت نے جب ٹیلی ویژن پر ان کا وقت گھٹا دیا تو استاد عمر تلمسانی نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ انھیں ہفتے میں دو گھنٹے کے بجائے روزانہ دو گھنٹے ٹیلی ویژن پر درس کے لئے دیئے جائیں۔ اس طرح موصوف جب جیل سے رہا ہونے لگے تو انھوں نے جیل سے باہر قدم رکھنے سے پہلے یہ شرط عائد کر دی کہ قبطیوں کے رہنما پوپ شنودہ کو بھی رہا کیا جائے۔ جب تک پوپ شنودہ کو رہا نہیں کیا جائے وہ بھی جیل سے باہر نہیں نکلیں گے۔ قبطی مصر کے عیسائیوں کا طائفہ ہے اور وہ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔

مرحوم صبر پسند سیاست کے علمبردار تھے۔ اخوان پر تشدد کا راستہ اختیار کرنے کے الزامات عائد کئے گئے لیکن تلمسانی مرحوم نے اپنی حکمت و بصیرت کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ تشدد حکومتوں کی طرف سے ہوتا رہا ہے۔ اخوان تشدد کی سیاست سے بری ہیں۔ مرحوم نے ان نوجوانوں کو بھی صحیح راستے پر ڈالنے میں بڑی محنت کی جو حالات کے دباؤ کی وجہ سے تشدد اور توڑ پھوڑ پر اتر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج مصری نوجوان کی اکثریت پر امن تبدیلی کی حامی بن چکی ہے۔ "جماعت التکفیر والہجرۃ" کے نوجوانوں نے جو انتہا پسند راستہ اختیار کیا تھا مصری نوجوان اس سے ہٹ کر اب امام حسن البنّاؒ، استاد حسن الہضیبی، اور قطب شہیدؒ کو جو تعذیب دی گئی اور جو نفسیاتی ہتھکنڈے ان پر آزمائے گئے ہیں انھیں قلم بیان کرنے سے قاصر ہے۔ مگر ان میں سے کوئی حربہ بھی ان کو راہِ حق سے نہ ہٹا سکا۔ ان کا روحانی رنگ

تشدد اور توڑ پھوڑ کے بجائے وہ پُر امن جد وجہد اور ذہنوں کی تبدیلی کے ذریعے انقلاب کے علمبردار تھے

بھی عزیمت کا ایسا گوہر نکلا کہ اس نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی، مگر طاغوت کے آگے جھکنا تو کجا اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ استاد عمر تلمسانی کی ایمانی کیفیت اور غیر معمولی

عزیمت کا اندازہ آپ اس واقعے سے لگا سکتے ہیں کہ ایک مرتبہ انھیں ذلیل کرنے کے لئے جیل میں ایک حسینہ کو لایا گیا اور اس مظلوم خاتون کو مادر زاد ننگا کر کے بھائی کے سامنے لا کھڑا کیا گیا۔ اس بندۂ خدا نے ظالموں کے اس کریہہ حربے کو بھی صبر و ثبات کے ساتھ برداشت کر لیا اور ان کی ساری اسکیم قوتِ ایمانی کی مدد سے ناکام کر کے رکھ دی۔

عبدالناصر کی موت کے بعد جب انور السادات برسرِ اقتدار آیا تو اپنے دورِ حکومت کو سابقہ دور (جس کے اندر وہ بھی برابر کا شریک تھا) سے امتیازی حیثیت دینے کے لئے "ریاستِ علم و ایمان" کا نعرہ بلند کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مصری حکومت اگرچہ پہلے اشتراکیت اور لادینیت پر قائم تھی تو اب اس کا بنیادی نظریہ تبدیل کر کے ایمان اور علم کو حکومت کی اساس قرار دیا جا رہا ہے۔ ناصر کے قائم کردہ آمرانہ نظام کے اندر بھی کچھ تبدیلی کی۔ اور جمہوری اداروں کے قیام اور عدلیہ کی آزادی کا راستہ کسی حد تک اختیار کیا اور اس پولیس جاسوسی نظام کو بدل دیا جو ۱۹۵۴ء سے قائم چلا آ رہا تھا اور جس کی وجہ سے باپ بیٹے سے اور بھائی بھائی سے خائف رہتا تھا۔ اخوان اسیروں کے ورثا نے ان بدلے ہوئے حالات سے فائدہ اٹھایا اور مصری عدالتوں کے اندر اپیلیں دائر کر دیں جن کے نتیجے میں ہزاروں بے گناہ لوگ ۱۷ سال یا اس سے کم و بیش عرصے کے بعد جیلوں سے نکل کر دنیا کی روشنی میں آئے۔ استاد عمر تلمسانی بھی ان لوگوں میں سے تھے۔ اس وقت اخوان کے مرشدِ عام استاد حسن الہضیبیؒ تھے۔ وہ گو ۱۹۶۷ء کے بعد جیل کے بجائے گھر میں مقیم تھے مگر ان کا گھر ان کے لئے جیل بنا دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں انھیں بھی نظر بندی سے نجات ملی اور وہ پہلی مرتبہ حج کے لئے ملک سے باہر آئے۔ حج کے بعد وہ کچھ عرصہ تک زندہ رہے۔ چونکہ جیل کی زندگی نے ان کی صحت بھی تباہ کر دی تھی اس لئے وہ ۱۹۷۲ء کے آخر میں انتقال فرما گئے۔ ان کے بعد اخوان المسلمون کی سربراہی کا بوجھ استاد عمر تلمسانی کے سر پر آ پڑا۔ مرحوم تادمِ واپسیں اس منصب پر فائز رہے۔

اخوان المسلمون کی قیادت کوئی آسان راستہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو مجاہدین کی قیادت ایک غیر معمولی شرف و فضیلت ہے، مگر دنیاوی لحاظ سے یہ کانٹوں کا تاج سر پر رکھنا صرف اولوالعزم بندوں کا کام ہے۔ اخوان المسلمون کے پہلے مرشدِ عام امام حسن البناؒ ۱۹۴۹ء میں کسمپرسی کے عالم میں شہید کر دیئے گئے۔ ۱۹۵۴ء میں ان کے چھ چوٹی کے رہنما جنہیں نامور قانون دان عبدالقادر عودہؒ بھی تھے،

دار پر لٹکا دیئے گئے۔ ۱۹۶۶ء میں اخوان کے نامور مفکر و مفسر اور ادیب و مجاہد سید قطب اور ان کے دو ساتھی عبدالفتاح اسماعیل اور یوسف ہواش کو پھانسی دے دی گئی۔ ۱۹۸۳ء میں ان کے ایک چوٹی کے رہنما کمال الدین سنانیری کو جیل میں شہید کر دیا گیا۔ (اس سے پہلے وہ بھی جیل میں ۱۰ سال قید بھگت چکے تھے۔ وہ ۱۹۸۱ء میں رہا ہوئے تھے۔) دوسرے مرشد عام استاذ حسن الہضیبیؒ بھی اخوان کی سربراہی کا کثر و بیشتر زمانہ جیل میں چکی پیستے ہوئے گزارتے رہے۔ یہی صورت حال تیسرے مرشد عام استاذ عمر تلمسانی کو پیش آئی۔ البتہ حسنی مبارک کے عہد میں، کسی مصلحت کے تحت انھیں محدود آزادی نصیب ہوئی اس محدود آزادی کے باوجود وہ دو باتوں پر مسلسل زور دیتے رہے ایک یہ کہ اخوان المسلمون کو بحال کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ اخوان کو اپنا رسالہ "الدعوۃ" قاہرہ سے دوبارہ جاری کرنے کی اجازت دی جائے۔ ان دونوں باتوں کو پورے کرانے میں انھوں نے آخر دم تک کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اخوان المسلمون کو بحال کرنے کے لئے انھوں نے قاہرہ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا تھا جس میں ۱۹۵۴ء کے اس سرکاری حکم نامے کو چیلنج کیا گیا تھا جس کی رو سے فوجی حکومت نے سیاسی پارٹیوں کی تشکیل ممنوع قرار دے دی تھی۔ استاد عمر تلمسانی کا عدالت کے سامنے موقف یہ تھا کہ اخوان المسلمون سیاسی حزب نہیں ہے بلکہ وہ اسلامی تحریک ہے۔ ابھی تک عدالت میں یہ مقدمہ زیر سماعت ہے۔ جہاں تک الدعوۃ کے اجراء کا تعلق ہے اس بارے میں بھی مصری حکومت استاذ عمر تلمسانی کے بنائے ہوئے نظام تربیت و اصلاح دعوت کا مظہر اور بن چکا ہے۔ پچھلے دنوں قاہرہ یونیورسٹی کے طلباء پر شدید ردعمل ہوا۔ مگر استاد

> وہ اس نظریے کے حامی تھے کہ اسلامی شریعت وہی لوگ نافذ کر سکتے ہیں جو اس پر سچا ایمان رکھتے اور عمل سے اس کا ثبوت فراہم کرتے ہوں

تلمسانی نے انھیں صبر کی تلقین کی اور حالات کو بگڑنے سے فی الفور بچا لیا۔ اب بھی مصر میں بار بار ایسے حالات پیدا ہوتے رہتے ہیں یا پیدا کئے جاتے ہیں کہ مصر کے اسلام پسند نوجوانوں کو مشتعل کیا جائے مگر ہمیں یقین ہے کہ اخوانی رہنماؤں کی تربیت کی بدولت وہ ایسا کوئی راستہ اختیار نہ کریں گے جس سے اسلام دشمن طاقتیں فائدہ اٹھا سکیں۔

مرحوم تحریک اسلامی پاکستان سے بڑی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ خاکسار کی ان سے سب سے پہلی ملاقات

استنبول میں ۱۹۸۰ء میں ہوئی۔ ہم سب لوگ ترکی کی اسلامی تحریک کے سربراہ پروفیسر نجم الدین اربکان کے مہمان تھے۔ ہمیں ترک نوجوانوں کے بڑے بڑے اجتماعات میں خطاب کرنے کا موقع ملا۔ حیرت یہ تھی کہ استاد عمر تلمسانی گو عمر رسیدہ اور بوڑھے تھے مگر جب خطاب کے لئے کھڑے ہوتے تو محسوس ہوتا کہ کوئی نوجوان گرج رہا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں وہ اسلامی جمعیت طلبہ کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لئے پاکستان تشریف لائے۔ وہ تقریباً دو ہفتے پاکستان میں رہے۔ منصورہ میں انھوں نے جو خطاب کیا، اس میں انھوں نے فرمایا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہم سب کے مرشد تھے اور جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون ایک ہی درخت کے دو شاخیں ہیں۔ ہمارا نوجوان فکری طور پر مولانا مودودیؒ کا ممنون ہے۔ مولانا کے لٹریچر نے ہمارے نوجوانوں کے اندر اسلام کی فکر کو مزید گہرا کیا ہے۔ ۱۹۸۳ء میں اسلامی تحریکوں کا ایک وفد جناب میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی پاکستان کی قیادت میں صدر مصر حسنی مبارک کی دعوت پر قاہرہ گیا۔ وفد کا مشن یہ تھا کہ مصری حکومت مصر کی اسلامی تحریک اور نوجوان نسل کے بارے میں اور کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے سلسلے میں اپنے رویے پر نظر ثانی کرے۔ مصر مسلمان ملک ہے۔ مصری مسلمانوں کی خواہش کے مطابق مصر میں اسلامی شریعت نافذ کی جائے۔ اس موقع پر ہم نے دیکھا کہ مصر کے حکام جن میں خود حسنی مبارک بھی شامل ہیں، استاد عمر تلمسانی کو بڑے احترام سے یاد کرتے تھے اور ان کے علم و فضل کے مداح تھے۔ اس کے باوجود شاید یہ حکام اس قدر آمادہ نہ تھے کہ اخوان المسلمون کو بحال کر دیں اور الدعوۃ کے دوبارہ اجراء کی اجازت دے دیں۔ ۱۹۸۴ء میں جب خرطوم میں جب جعفر نمیری کے دور میں شریعت کانفرنس منعقد ہوئی تو استاد عمر تلمسانی بھی خرابی صحت کے باوجود وہاں پہنچ گئے۔ مرحوم سے وہاں بھی ملاقاتیں رہیں۔ مرحوم اس نظریے کے علمبردار تھے کہ گو اسلامی شریعت بتدریج نافذ کی جا سکتی ہے، مگر اسے نافذ کرنے والے وہ لوگ ہونے چاہئیں جو شریعت پر سچا ایمان رکھتے ہوں اور عمل سے اس کا ثبوت فراہم کرتے ہوں اور ان کے پاس ایسے افراد کثرت سے ہوں جو نفاذ شریعت کے سلسلے میں تن من دھن کی بازی لگا کر اس مقدس کام کو انجام دے سکیں۔ آخری ملاقات ۱۹۸۵ء میں سیرت کانفرنس کے موقع پر قاہرہ میں ہوئی۔ وہ یورپ سے علاج کروا کر واپس آئے تھے۔ بہت ضعیف اور لاغر ہو چکے تھے ہم سے بڑی خوش دلی اور شوق سے ملے۔ اسی موقع پر اپنی شدید کمزوری کے باوجود وہ الاہرام کے نمائندے کو گھنٹہ بھر انٹرویو دیتے رہے اور تمام قومی اور بین الاقوامی مسائل پر آزادانہ اظہار خیال کرتے رہے۔ اس انٹرویو میں ان کو

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

رپورٹ: منیر احمد خلیلی

مرد حق آگاہ کا آخری سفر

جلوس جنازہ میں تمام طبقوں اور مکاتب فکر کے خواص و عوام نے ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی

موت ایک اٹل اور ازلی و ابدی قانون قدرت ہے۔ ہر آنے والے کو اس دنیا میں اپنی مقررہ سانسوں کی گنتی پوری کرکے عدم کی طرف کوچ کر جانا ہے۔ اس سے کوئی مفر نہیں۔ جو چیز عام ہو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس عنوان سے اگر کسی چیز کو اہمیت حاصل ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ مرنے والا جیا تو کس طور سے جیا اس کی زندگی اس کے مقصد وجود سے کس قدر ہم آہنگ تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنے خالق کی منشا اور رضا کے تحت جدوجہد کیا یا حیوانوں کی طرح چند جبلی ضرورتوں کی غلامی ہی میں ساری حیات بتا دی۔ تاریخ نے عظمت کا ایک معیار مقرر کر رکھا ہے اور حیات انسانی کے بارے میں تاریخ کے فیصلے اسی معیار کے مطابق صادر ہوتے ہیں۔ اسی حوالے سے بعض ہستیوں کو عظمت کے تاج کا مستحق گردانا جاتا ہے۔ تاریخ انھیں اپنے اوراق میں ایک انمٹ حوالے کے طور پر جگہ دیتی ہے اور اسی معیار پر جانچ کر کروڑوں انسان ایسے ہوتے ہیں جنھیں پرکاہ کے برابر اہمیت نہیں دی جاتی۔ دنیا کے گوشے گوشے میں ہر روز اٹھنے والے ہزاروں لاکھوں جنازے ایسے ہوتے ہیں جنھیں قبر میں اس طرح پھینک دیا جاتا ہے جیسے کوڑے کی ٹوکری سے کوڑا پھینک دیا جاتا ہے۔ ۲۳ مئی ۱۹۸۶ء جمعے کے روز بھی نہ معلوم کتنے مردے گورستان کی خاک میں چھپائے گئے ہوں گے۔ بس ان کے بچے داغ یتیمی کے باعث اور بیویاں بیوگی کے زخم کے باعث آہ و بکا اور چیخ و پکار کرکے رہ گئی ہوں گی۔ لیکن مصر کی سرزمین، قاہرہ کے شہر سے اسی روز ایک ایسا جنازہ بھی اٹھا جس کی موت پر پورے عالم اسلام میں ہزاروں بچے، ہزاروں نوجوان اور ہزاروں بوڑھے حزن و ملال، رنج و کرب میں ڈوبے، بے شمار آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ بے شمار [illegible]

یہ شخص جس کا جنازہ قاہرہ کے ایک قبرستان کی طرف جا رہا تھا جس کی نماز جنازہ وسط قاہرہ میں مسجد عمر مکرم میں پڑھی گئی۔ اس جنازے میں پچاس ہزار سے بھی زیادہ افراد شریک تھے۔ اس کی زندگی کا ایک چوتھائی سے بھی زیادہ حصہ حاکموں کے غضب و عتاب اور زنداں کی نذر ہوا۔ آج اس جنازے کے آگے آگے چلنے والوں میں مصر کے صدر حسنی مبارک کا ذاتی نمائندہ عبداللہ عبدالعزیز بھی تھا۔ مرنے والا کبھی اقتدار میں نہیں رہا

کہ اس سے کسی نے کوئی سیاسی فائدہ اٹھایا ہو لیکن اس کے جنازے میں مصر کی تقریباً تمام سیاسی تنظیموں کے سربراہ یا ان کے نمائندے شامل تھے۔ وہ پارلیمنٹ کا ممبر نہیں تھا لیکن جنازے میں رفعت المحجوب سپیکر پارلیمنٹ بھی تھے۔ وہ وزیر وغیرہ کچھ بھی نہ رہا، مرنے والا اتحاد اسلامیہ کا حامی اور کٹر مسلمان تھا لیکن جنازے میں عیسائی کلیسا کا نمائندہ بھی پیش پیش ہے۔ مرحوم عرف عام میں کسی دینی درسگاہ سے دستار فضیلت کا بھی حامل نہیں رہا لیکن جنازے میں مصر کے موجودہ دور کے مقبول عالم دین اور مفسر قرآن شیخ محمد متولی الشعراوی بھی شامل ہیں جو خود ہسپتال سے دو تین روز قبل ہی فارغ ہوئے۔ مرنے والا درویش منش اور قلندر صفت مرد حق آگاہ و مجاہد تھا لیکن جنازے میں درویش بھی ہیں، علماء بھی ہیں، وزراء اور ارکان پارلیمنٹ کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔

شیخ عمر تلمسانی مرشد عام اخوان المسلمون مہینہ بھر شدید علالت میں مبتلا رہ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ انھیں کا جنازہ ہے جس کے تذکار کی تمہید اور حیثیات کا اجمالی ذکر سطور بالا میں ہوا۔ یہ اسی فقیر منش کی حالت ہی کے سفر آخرت کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں جس کے محبوب خلائق اور مقبول عام ہونے کا ثبوت اس کے جنازے کا جلوس ہے۔ جس کی زندگی درویشی کی ایسی علامت تھی کہ مصنوعی رنگ درویشی رکھنے والے اس کی درویشی سے پناہ مانگتے تھے اور جس کی موت پر نہ معلوم کتنے وزیروں کتنے عہدہ داروں کتنے ارکان پارلیمنٹ اور کتنی سیاسی اور مذہبی تنظیموں کے قائدین نے اس موت پر رشک کیا ہوگا۔

عمر تلمسانی کی نجی زندگی ہماری دینی تحریکوں اور تنظیموں کے ذمہ داروں اور قائدین کے لیے ایک آئینہ صاف ہے، کہ جس پر پورا اترنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ان کی جیل سے باہر ساری زندگی دو تین کمروں کے ایک چھوٹے فلیٹ میں بسر ہوئی جنھیں آج کے دور کے لحاظ سے بڑا سامان زینت تین چار کرسیاں اور ایک میز تھی جو اس کمرے میں پڑے تھے جسے مرحوم شیخ کی خوابگاہ، مہمان خانہ اور دفتر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ گھر میں سامان آسائش و راحت میں شمار ہونے والا ایک پنکھا تھا جو انھیں کسی عقیدت مند نے بطور تحفہ دیا تھا۔ ساری زندگی کی گزر بسر [illegible] تقریباً ساڑھے چار سو روپیہ پر ہوئی جو ان کا مستقل اور حلال ذریعہ آمدنی تھی۔ اخبارات اور رسائل میں لکھتے رہے ان سے کبھی معاوضہ وصول نہ کیا۔ اخبار "شرق اوسط" نے ان کی یادداشتیں شائع کرنا شروع کیں، ایک معقول معاوضے کی پیش کش ہوئی، شیخ نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ تاریخ بیچی اور خریدی نہیں جاتی۔ [illegible] اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے گھر کے دروازے پر کسی کیلئے

ہر وقت کھلے رہتے۔ شیخ عزلسانی کو دنیا کے تمام مذہبی اور سیاسی رہنماؤں میں ایک امتیاز یہ حاصل ہے کہ اخبارات و رسائل، ریڈیو اور ٹیلیویژن کے بڑھتے (اثر و) زندگی میں انھوں نے دیے تھا یہ کبھی اور دوسرا نہ دیکھے ہوں وجہ یہ تھی کہ وہ دوا ہی تکلف کے عادی نہ تھے جو آیا اس نے جو کچھ پوچھا شیخ نے صاف دلی سے اور صاف گوئی سے کہہ دیا۔

ساری زندگی شہادت و دعوت حق میں گزار دی، خاندانی پس منظر، تعلیم اور صلاحیتیں ایسی رکھتے تھے کہ اگر چاہتے تو بڑے سے بڑے منصب تک پہنچ سکتے تھے بے پناہ دولت کما کر عیش و عشرت کی زندگی گزار سکتے تھے لیکن شیخ نے کانٹوں بھری راہ کا انتخاب کیا جس میں قدم قدم پر ابتلا و آزمائش، مصیبتیں اور کلفتیں تھیں، زنجیر و سلاسل کے حلقے تھے، زندان خانے تھے، اور شیخ نے اللہ کی رضا کی خاطر اسی دوسری راہ کا انتخاب کیا، سرخرو ہو کر اپنے رب کی رضا میں ڈوبے ہوئے اس دنیا سے اٹھے اور لاکھوں افراد کے لئے اپنے کردار کی قابل رشک و تقلید مثال چھوڑ گئے۔ اللہ ان کے درجات کو بلند کرے۔ آمین

(بقیہ قرآن کی ادبی خصوصیات)

علامہ قاضی باقلانی نے قرآن کے اعجاز کو تین چیزوں میں محدود کر دیا ہے (۱) قرآن کے اندر غیبی سلسلے میں جو خبریں دی گئی ہیں اس تک بشری قوت و استطاعت کی رسائی محال ہے اور نہ ہی (ان تک رسائی) ہونے کا کوئی راستہ ہے (۲) دوسری چیز یہ کہ گذشتہ اقوام و ملل کے سلسلے میں قرآن میں جو واقعات نہایت نظم و ترتیب سے بیان کئے گئے ہیں (۳) اس کے کلام کے اندر پائی جانے والی وہ اعلیٰ فصاحت و بلاغت جس کی بلندیوں کو بلاغت کی کوئی قسم نہ پا سکی، لیکن آگے چل کر باقلانی نے قرآن کے اعجاز کے سلسلے میں تشریح کرتے ہوئے اس کے اندر پائے جانے والے اعلیٰ ربط و ترتیب پر کافی زور دیا ہے۔

امام رازی نے قرآن کا تمام تر اعجاز اس کی فصاحت، منفرد اسلوب اور اس کے کلام کے تمام تر ادبی عیوب سے پاک ہونے میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابن حازم کا خیال ہے کہ اس کا اعجاز قرآنی کلام کے اندر فصاحت و بلاغت کے جمیع اقسام کے پائے جانے اور کسی انسان کے اس تک نہ پہنچنے کے سبب سے ہے۔

تعارف و تبصرہ

نام کتاب: نظریہ ادب و ادیب   مؤلف: شاہ ودود شاہ عثمانی   صفحات ۱۳۶

کتابت و طباعت عمدہ   [illegible]   قیمت ۲۰ روپیہ

ملنے کا پتہ:- [illegible]

جولائی [illegible] کی بات ہے [illegible] ایک نوجوان کو لئے ہوئے دفتر حیات نو میں تشریف لائے [illegible] آپ شاہ ودود شاہ عثمانی ہیں، وہ تین کتابوں کے مصنف [illegible] اور ادیب [illegible] بات یہ کہ نوجوان ہیں۔ ۲۸، ۳۰ کے قریب عمر ہے [illegible] ان کی تین کتابیں حیات نو میں تبصرہ کے لئے [illegible] ۹۲ صفحات ہیں، دانش تہذیب، پیام حسین [illegible] وغیرہ اس کتاب کے عنوانات ہیں یہ ان کی پہلی کتاب ہے [illegible] مطالعہ کی کمی [illegible] اور تشنگی بہت نمایاں ہے [illegible] کہ اگر آدمی کوشش کرے تو منزل کی طرف بڑھ سکتا ہے۔

دوسری کتاب "روشن حیات" ہے [illegible] کا مطالعہ کیا گیا ہے، حضرت شاہ محمد قاسم، حضرت شاہ مجیب الحق، حضرت شاہ [illegible]، حضرت شاہ محمد علی، حضرت شاہ غلام امام

تیسری کتاب نظریہ ادب اور ادیب ہے مصنف نے ڈاکٹر عبد المغنی، حفیظ میرٹھی، اسمٰعیل [illegible] مترجم، [illegible] عابد حسین اور [illegible] وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے، اور مفید معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کی [illegible] مطالعہ اور تحریر کے اعتبار سے یہ ایک کامیاب کوشش ہے البتہ جن شخصیات کا اس میں مطالعہ کیا گیا ہے ان کے بارے میں قاری کچھ زیادہ کا طالب ہے [illegible] کہ [illegible] کتاب کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔

عبدالرحمان خالد
اشتیاق محمد
انور خان نور

حلقۂ یاراں

برادر محترم طارق فارقلیط صاحب! سلام و رحمت

حیات نو اگست ۱۹۸۹ء کا تازہ شمارہ ملا۔ ہندوستان کی تازہ ترین صورت حال پر آپ نے بڑے اچھے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ آپ کا اداریہ جینے کی نئی امنگ پیدا کرتا اور امید کی نئی شمعیں جلاتا ہے۔ ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ ہندوستان کے حالات انتہائی مایوس کن ہیں، خصوصاً مسلمان اقلیتوں کے لئے تو ناگفتہ بہ ہیں۔ ابھی ہم الٰہ آباد کے فسادیوں کو اچھی طرح رو بھی نہیں سکے تھے کہ احمد آباد کا روح فرسا اور انسانی تاریخ کا بدترین فساد رونما ہو گیا۔ بچے، عورتیں، نوجوان اور بوڑھے زندہ جلا دیئے گئے اور دکانوں کو تہ تیغ کر دیا گیا، پولیس مسکراتی رہی، حکومت تماشا دیکھتی رہی اور مرکزی حکومت کے سربراہ راجیو گاندھی غیر ملکی دورے کرتے رہے۔ یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ ہماری حکومت افریقہ میں تو امن قائم کرنے کے لئے بے تاب ہے اور بیان پر بیان دیئے جا رہی ہے مگر اپنے گھر میں زندہ انسان جلائے جا رہے ہیں اور مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے مگر اس کی فکر اس کو نہیں ہے۔ ہائے افسوس انسان کا نقطۂ نظر کتنا بدل گیا ہے۔

مسلم صاحب کی موت اردو صحافت کا ایک عظیم حادثہ ہے۔ وہ پوری ملت کا سرمایہ تھے۔ مقبول احمد فلاحی صاحب کا مضمون بہت خوب ہے۔ انتشار ملت کے نئے اسباب کی نشاندہی اور اس کے تدارک پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ظہار اثر نے شاہ ولی اللہ کو بڑے انقلابی انداز میں پیش کیا ہے۔

افغانستان میں ڈاکٹر نجیب اللہ کا کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے تقرری اور ببرک کارمل کا ہٹایا جانا اپنے اندر ایک معنویت رکھتا ہے اور یہ کسی نئی چال کی تیاری ہے۔ عزیز گھروی کا [illegible] بہت خوب ہے۔ نظمی سکندرآبادی کا یہ شعر

فانوس تو بن جائیں گے یہ ہاتھ ہمارے — جلتی ہوئی شمعوں کو بجھانے کے نہیں ہیں

اور شاکر تسلیم کا یہ شعر — سارے کمان داروں کے رُخ ÷ میری جانب ہوں تیر — بہت خوب ہیں۔

خاکسار: عبدالرحمان خالد

ایڈیٹر صاحب السلام علیکم

جولائی کا حیات نو دیکھا تو [illegible] رسالہ ترقی کی طرف گامزن ہے۔ ایسے رسالے کی کمی ہے جو قوم کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلائیں۔

اداریہ "بچوں کی تعلیم و تربیت" [illegible] والا ہے وہ بجا اور درست ہے۔ جب اداریہ میں علی گڑھ کا ذکر آ ہی جاتا [illegible] علی گڑھ نے مسلم بچوں کی تعلیم و تربیت میں ایک اہم رول ادا کیا ہے [illegible] طرح مسلمان تعلیم کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں [illegible] تعلیم حاصل کریں کیونکہ وہ مسلمانوں کے کرسچن کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے نتیجے [illegible] تحریروں میں کیا ہے اور یہی سبب تھا کہ وہ قوم [illegible] چاہتے تھے کہ دنیاوی تعلیم سے مسلمان غافل ہوں نہ دین سے [illegible] ہے وہ سرسید کے اس خیال سے بھی واقف ہے کہ وہ چاہتے تھے "مسلمانوں کے [illegible] ایک میں نیچرل سائنس اور سر پر کلمہ لا الہ الا اللہ کا تاج ہو [illegible] ہیں۔ آج علی گڑھ کے لوگ علی گڑھ تحریک سے غافل ہیں اور [illegible] بچے OUR LADY OF FATIMA میں تعلیم حاصل کرتے [illegible] سمجھتے ہیں کہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

انٹرویو کا سلسلہ بھی پسند آیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی کا انٹرویو بہت اچھا [illegible] عارف اعظمی صاحب کا مضمون "اسلامی تاریخ میں فن تعلیم کے ارتقائی مراحل" بھی پسند آیا۔ اس طرح کے تعلیمی اور معلوماتی مضامین رسالے کی اہمیت بڑھاتے ہیں، کمی اور تشنگی کو دور کرتے ہیں۔

"حیات نو" پچھلے سے بہتر ہو گیا ہے۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ کتابت اور تصحیح پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

خاکسار: اشتیاق احمد، ظفر منزل، امیر نشان، سول لائن، علی گڑھ۔

صدیق محترم طارق فارقلیط صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ جون کے شمارہ میں میری غزلوں کی اشاعت کے لئے سپاس گزار ہوں۔

[illegible]

نور محمد فلاحی، سکریٹری انجمن

جامعہ کے لیل و نہار

جامعۃ الفلاح نے اپنی کم عمری ہی میں جو ملک گیر شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی ہے اور جس رفتار سے ترقی کرتا چلا آرہا ہے اسے اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس پر رب کریم کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے طوفانی دور میں اللہ کے دین اور اس کے رسول کی اُمّت کو جن اندرونی و بیرونی چیلنجوں کا سامنا ہے جامعۃ الفلاح انھیں چیلنجوں کا ایک پر عزم جواب ہے۔

ہندوستان میں بہت سے ادارے اور جامعات ہیں مگر جامعۃ الفلاح کو ان میں اس وجہ سے مزید نمایاں مقام حاصل ہے کہ اس نے اپنے اہم مقاصد کے حصول کے لئے ایک ایسا نصاب مرتب کیا ہے جس میں دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کو بھی مناسب جگہ دی گئی ہے۔ اور وہ جامعہ ہے جس نے بچے اور بچیوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کا معقول انتظام کیا ہے۔ چنانچہ جہاں ہر سال بچوں کی ایک اچھی خاصی تعداد سند فضیلت حاصل کرتی ہے وہیں بچیاں بھی ان سے پیچھے نہیں رہتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ جامعہ کو تنگ دامنی کی شکایت کرنی پڑتی ہے۔ ہر سال کی طرح امسال بھی کثیر تعداد میں درخواستیں واپس کرنی پڑیں۔ نہ بچے اور بچیوں کے رہنے کے لئے بورڈنگ میں جگہ ہے اور نہ طلبہ اور طالبات کی تعلیم کے لئے درسگاہوں میں جگہ ہے۔ اس وقت طلبہ وطالبات کی کل تعداد ۲۶۰۵ ہے، مختلف مکاتب کے طلبہ کی تعداد اس سے زائد ہے۔ ۶۷ معلمین و معلمات درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ دیگر انتظامی اسٹاف اور دوسرے ملازمین کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ جامعۃ الفلاح میں طلبہ وطالبات کی کثرت پر مولانا مودودیؒ کا وہ قول بالکل صادق آتا ہے کہ "جامعۃ الفلاح کے مؤذن نے حی علی الفلاح کی آواز اس زور سے لگادی ہے کہ جامعہ کو مصلیوں کی کثرت سے تنگ دامنی کی شکایت کرنی پڑے گی"

اس سال جمعیۃ الطلبہ نے موجودہ طلبہ کی تعلیم و تربیت کے لئے مختلف پروگرام بنائے ہیں۔ تحریری و تقریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے وہ جہاں پروگرام چلارہی ہے وہیں اس نے تربیت ترقی اور

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر)